اجتہاد و تقلید پر
اعتراضات کا تجزیہ



جمع و ترتیب سید عابد حسین زیدی

پیغام وحدتِ اسلامی کراچی

اجتہاد و تقلید پر
اعتراضات کا تجزیہ

جمع و ترتیب

سید عابد حسین زیدی

ناشر

پیغامِ وحدتِ اسلامی

کتاب کی شناخت

نام کتاب	:	اجتہاد وتقلید پر اعتراضات کا تجزیہ
مؤلف	:	سید عابد حسین زیدی
کمپوزنگ	:	الباسط پرنٹرز 021-6606211
پروف ریڈنگ	:	سید رضا عباس عابدی (محمد)
مطبع	:	الباسط پرنٹرز
ایڈیشن	:	پنجم
تعداد	:	ایک ہزار
سال طبع	:	۲۰۰۹ء

مدرسة القائمؑ

50-A بلاک 20، سادات کالونی، فیڈرل بی ایریا، کراچی

فون: 0334-3102169 , 021-36366644

ویب سائٹ: www.al-qaaim.com ای میل: info@al-qaaim.com

انتساب

ان عظیم المرتبت علماء و مراجع

کے نام

جنہوں نے اپنے قلب کے لہو کو

قلم کی سیاہی میں بدل کر

شجر دین اسلام کی

آبیاری کی

مقدمہ

اجتہاد و تقلید ایک ایسا موضوع ہے جس پر اردو زبان میں بہت کم کتب لکھی گئی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں اگرچہ بزرگ تقلید کے فلسفے سے آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ عملاً اس پر گامزن بھی رہے ہیں لیکن جس انداز سے نوجوان نسل نے فلسفہ اجتہاد کو قبول کیا ہے وہ اس پر آشوب دور میں دین اسلام کی جاذبیت اور آفاقیت کی مستحکم دلیل ہے۔ خاتم النبیین، آئمہ کرام علیہم السلام نے اجتہاد کا دروازہ اپنی حیات ظاہری ہی میں کھلوا کر اسلام جیسے دین کو ہمیشہ کے لئے ایک جمود سے بچالیا ہے مذہب اہلبیت کی یہ روش اس کو دیگر مکاتب فکر سے ممتاز کرتی ہے۔ اجتہاد کو اسلام چلانے کا انجن بھی کہا جاتا ہے۔ مجتہد افکار کے خام مال کو اس انجن کی بھٹی میں پیس کر اجتہادی عمل انجام دیتا ہے اور دوسری طرف سے اس کو قابل عمل حالت میں معاشرے میں سپلائی کر دیتا ہے۔ کیونکہ عوام الناس کما حقہ تحقیق کیے بغیر ان افکار کو خام (CRUDE) حالت میں استعمال نہیں کر سکتے۔ موجودہ دور کے مسلمان اسکالرز جن میں مفکرِ پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ کے صاحبزادے ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال نمایاں ہیں، اس جدوجہد میں مصروف عمل نظر آتے ہیں کہ اجتہاد جسے دیگر مسلمان مکاتبِ فکر ترک کر چکے ہیں دوبارہ

قابل عمل بنایا جائے۔ اس کتاب میں جس موضوع کو زیر بحث لایا گیا ہے یعنی "اجتہاد و تقلید پر اعتراضات اور ان کا مدلل جواب" اس سے قبل اس موضوع پر کوئی کتاب منظر عام پر نہیں آئی۔ طرز تحریر میں استدلال اور آیات و اخبار و حکایات سے بکمال خوبی و خوش اسلوبی سے استفادہ کیا گیا ہے اور حقائق کو بڑی سلیس اور سادہ زبان میں پوری تفصیل سے ایسے انداز میں بیان فرمایا ہے کہ ہر ذہن با آسانی سمجھ لے۔ اس کتاب کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں اختلافات مجتہدین جیسے نازک موضوع کو بڑی باریک بینی سے اس کے اسباب و علل کا جائزہ لیتے ہوئے زیر بحث لایا گیا ہے اور سادہ مثالوں کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے تا کہ عوام الناس کو ایک طرف اس الجھن سے نجات دلائی جائے اور دوسری طرف ایسی کوششوں کا قلع قمع کرنے میں بھی اقدام کیا جائے جو اجتہادی فکر کو نقصان پہنچانے کے لئے کی جارہی ہیں تا کہ شیعیت اسی بٹاؤ اور جمود کا شکار ہو جائے جس فتنہ میں دوسرے مذاہب گرفتار ہوئے۔

آخر میں میں قومی تفکر کے لئے اتنا کہنا ضروری سمجھوں گا کہ مذہب حقہ پر قائم رہتے ہوئے اجتہاد و تقلید پر اعتراض محض جہل مقصری کے علاوہ کچھ نہ ہوگا کیونکہ امام حسن عسکری علیہ السلام کا واضح ارشاد موجود ہے کہ

"عوام الناس کے لئے ضروری ہے کہ فقہاء یعنی احکام شریعت کو تفصیل و تحقیق کے ساتھ جاننے والوں میں سے جو شخص اپنے دین کی حفاظت کرنے والا ہو، اپنی نفسانی خواہشات کا تابع نہ ہو اور رسول کا فرمانبردار ہو اس کی تقلید کریں۔"

نیز امام زمانہ حضرت حجت علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

"زمانہ غیبت کبریٰ میں پیش آنے والے حالات کے سلسلے میں ہماری حدیثوں کو بیان کرنے والے علماء کی طرف رجوع کرو کیونکہ وہ ہماری طرف سے تم پر حجت ہیں

اور میں اللہ کی طرف سے تم پر حجت ہوں۔"

آخر میں اس دعا کے ساتھ کہ پروردگار بہ تصدق محمدؐ وآل محمدؐ اس کتاب کی تصنیف وطباعت نیز عوام الناس تک پہنچانے میں تگ ودو کرنے والوں کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

والسلام

الاحقر

ڈاکٹر سید محمد حسن رضوی

فہرست

پیش لفظ

اگر وسعتِ قلبی اور بالغ نظری سے دیکھا جائے تو اس وقت دنیا کے تمام مذاہب میں فقط اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جسے ہر طبقے کے لوگ تیزی سے قبول کر رہے ہیں خصوصاً براعظم یورپ اور امریکہ میں اسلام جس سرعت کے ساتھ پھیل رہا ہے اس کی وجہ سے اسلام دشمن طاقتیں بے حد مضطرب نظر آتی ہیں۔ ہم ان حالات کو اس انداز سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ جدید دنیا جو خطۂ زمین سے باہر پرواز کر چکی ہے دوسرے سیاروں پر وجودِ زندگی کے متلاشی، کائنات پر حکومت کرنے کا خواب دیکھنے والی تہذیب یافتہ متمدّن دنیا آج زندگی کے دوراہے پر کھڑی ہے کہ یا تو دامن اسلام میں پناہ حاصل کرے یا مذہب کی قید و بند سے آزادی حاصل کرے، اس کی وجہ غالباً فقط ایک ہی ہے اور وہ ہے اسلام کی آفاقیت۔ چودہ سو سال پیشتر پیش کی گئی آیاتِ قرآنی آج حرف بہ حرف سچائی پر منطبق ہو رہی ہیں۔ جوں جوں سائنس ترقی کی منازل طے کرتی جا رہی ہے اسلامی احکام کی حقانیت سامنے آتی جا رہی ہے۔ یہ اسلامی احکام خواہ آیاتِ قرآنی کی صورت میں ہوں یا احادیثِ نبویؐ و ارشاداتِ آئمہ طاہرین علیہم السلام کی صورت میں ہوں، بنی نوع انسان کے لئے بہر حال فلاح و خیر خواہی کا منبع ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کلام الٰہی و ارشادات نبویؐ و آئمہ طاہرین علیہم السلام اتنے سادہ ہیں کہ ہر شخص انہیں باآسانی سمجھ سکے کیونکہ خود قرآن نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ۔ ''اس قرآن کی کچھ آیات محکم ہیں اور کچھ متشابہ''۔ اب یہاں سب سے اہم مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک عام شخص کیسے پہچانے کہ کونسی آیت محکم ہے اور کونسی متشابہ۔ ایسے ہی دیگر نکات کو حل کرنے کے لئے اسلام میں ریسرچ یعنی اجتہاد کا باب تفویض کیا گیا ہے۔ یہ اجتہاد ہر انسان کو دعوت دے رہا ہے کہ آؤ دریائے اجتہاد میں غوطہ لگاؤ اپنی تشنگی بجھاؤ۔ لیکن بدقسمتی سے اس عظیم نعمت کو سمجھنے سے بہت سے بلکہ اکثر لوگ قاصر ہیں کچھ اپنی کم عقلی کی وجہ سے اور کچھ اسلام دشمن طاقتوں کی سازش کے نتیجے میں۔

اس کتاب کے لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ جدید دور میں اعتراضات میں بھی جدت پیدا ہوگئی ہے۔ لہٰذا اگر ان اعتراضات کو عقلی انداز اور نفسیاتی طریقے سے جلد از جلد دور نہ کیا گیا تو اس بات کا خدشہ ہے کہ کم عقلی کی وجہ سے اجتہاد و تقلید کو اپنی ناقص و ناکمل عقل کی کسوٹی پر پرکھنے والے افراد کہیں اپنے اوپر اس چیز کو واجب نہ کرلیں کہ اس عظیم تحفہ اجتہاد کو مٹانا ان کے فرائض میں شامل ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ معاشرے کے مختلف طبقات خصوصاً تعلیم یافتہ طبقہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد بہت سی غلط فہمیوں سے نجات حاصل کریں گے۔

ناشر

اجتہاد و تقلید

کیا ہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اجتہاد و تقلید کیا ہے؟

کسی بھی موضوع میں جب انسان کوئی مطلب سمجھ نہ سکے اور اسے دوسروں سے اتباعاً اخذ کرے اسے تقلید کہتے ہیں۔ البتہ تقلید کے زیادہ تر مواقع ایسے ہیں جہاں تعلیم اور تجربے کی احتیاج ہوتی ہے۔ کیونکہ کسی بھی علم سے بے بہرہ افراد، عالم و ماہر و تجربہ کار ہی سے علم کے مسائل حاصل کرتے ہیں۔ لہذا ایسے افراد کو مقلّد اور عالم و ماہر فن کو اس علم و فن کا مجتہد کہا جاتا ہے۔

شرعی احکام کو سمجھنے اور انہیں حاصل کرنے کے لئے کچھ شرائط کا ہونا ضروری ہے جو سب لوگوں کو میسر نہیں کیونکہ اس بات میں تو شک نہیں ہے کہ ادیان آسمانی میں کسی دین نے اپنے پیروکاروں کو حیوانات کی طرح بلا تکلیف نہیں چھوڑا بلکہ کچھ احکام و دستور معین کئے تاکہ ان کا علم حاصل کر کے ان پر عمل کیا جائے۔ دین اسلام نے بھی کچھ احکام و قوانین بیان کئے ہیں جن کو قرآنی آیات اور احادیث معصومینؑ سے کافی دقت کے ساتھ مخصوص شرائط کو پیش نظر رکھ کر حاصل کیا جاتا ہے۔ لہذا جو شخص خود تحقیق

کرے اور مذکورہ بالا مدارک سے اپنے روزمرّہ کے مسائل کو حاصل کرے وہ مجتہد ہے اور جو شخص اتنی صلاحیت نہیں رکھتا یا اتنا وقت نہیں رکھتا اس کو چاہیئے کہ وہ مجتہد کی پیروی کرے، ایسے شخص کو مقلِد کہتے ہیں۔

تقلید کے مفہوم سے ناآشنائی

معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ تقلید کے منکر ہیں یا تقلید کے حرام ہونے کا فتویٰ دیتے ہیں وہ اصلاً تقلید کے معنیٰ و مفہوم سے ہی غافل ہیں اور انہوں نے اس بارے میں علماء کی مراد نہیں سمجھی کیونکہ اگر تقلید کے معنیٰ یہ لئے جائیں کہ کوئی مجتہد یہ کہے کہ پیغمبرؐ اور امامؑ کا فرمان یہ ہے اور اس کے مقابلے میں میرا فتویٰ یہ ہے تو ایسے مجتہد کی تقلید بدعت اور حرام ہے۔ کیونکہ احکام کے حصول میں قرآن و سنت کے علاوہ کسی کی بات قابل قبول نہیں۔ لیکن اگر فرض کریں کہ ایک شخص نے سالہا سال کی زحمت و تکلیف کے بعد آیات قرآنی و روایاتِ معصومینؑ سے احکام و قوانینِ الٰہی کو حاصل کیا ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے، انہی کی طرف سے کہتا ہے تو اس صورت میں جو شخص کلامِ خدا اور فرامین آئمہؑ سے احکام خدا کو حاصل نہیں کر سکتا اور اس بات کی طاقت و قدرت و وقت بھی نہیں رکھتا وہ اپنے دینی مسائل میں ایسے عالم و مجتہد کی بات مانے تو یقیناً ایسی تقلید نہ فقط عقلاً صحیح ہے بلکہ آئمہؑ کے دستور کے مطابق لازم و واجب ہے (جیسا کہ آگے چل کر روایات آئیں گی)۔

پس یہ بات واضح ہوگئی کہ مجتہد کا فتویٰ دراصل خدا، رسولؐ اور آئمہؑ کے فرامین سے حاصل شدہ مطلب کا بیان ہے نہ کہ جس کو اس نے اپنی طرف سے بنالیا ہو۔ اگر کوئی مجتہد کہے میری رائے اور فتویٰ اس طرح ہے تو اس کا مقصد یہ ہوگا کہ جو کچھ میں نے قرآن و حدیث و فرامینِ آئمہؑ سے سمجھا وہ یہ ہے ورنہ اس کی تقلید، رائے، فتویٰ

قابل قبول نہ ہوں گے اس سے پہلے کہ ہم اجتہاد وتقلید سے متعلق معترضین کے اعتراضات کا جواب دیں مناسب ہوگا کہ قرآن واحادیث سے اجتہاد وتقلید کے ثبوت فراہم کردیں۔

اجتہاد وتقلید کا قرآن سے ثبوت

(۱) قرآن مجید میں سورۂ توبہ کی آیت نمبر۱۲۲ ہے کہ

وما کان المومنون لینفرو کافة ط فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفةٌ لیتفقهوفی الدین ولینذر قومهم اذا رجعو الیهم لعلّهم یحذرونO

ترجمہ: یعنی مومنین کے لئے اپنے وطن کو تحصیل علمِ دین کے لئے چھوڑنا ممکن نہیں ہے پس حتماً ہر گروہ میں سے چند آدمیوں کا تحصیلِ علمِ دین کے لئے جانا ضروری ہے اور جب وہ اپنے وطن واپس آئیں تو ان کو چاہیئے کہ وہ دوسروں کو دینی احکام کی تعلیم دیں اور انہیں عذابِ الٰہی سے ڈرائیں شاید وہ ان کی گفتار کی پیروی کرتے ہوئے عذاب الٰہی سے ڈریں۔

یہ آیت شریفہ (تفقہ) یعنی تحصیلِ علمِ دین کو بعض افراد کے لئے واجب قرار دینے کے علاوہ ان احکام کو دوسروں تک پہنچانا بھی لازم قرار دے رہی ہے البتہ احکام دین کو حاصل کرنے اور انہیں دوسروں تک پہنچانے کے ۲ طریقے ہیں جو قابلِ عمل ہیں کہ آیت شریفہ جن کی تائید کررہی ہے۔

پہلا طریقہ

خود اصل روایت کا حاصل کرنا اور دوسروں تک پہنچانا۔ غالباً سابقہ زمانے میں

اصحابِ معصومینؑ کا طریقہ بھی یہی تھا یہی وجہ ہے کہ ان کو راوی یا ناقلینِ حدیث کہا جاتا تھا اور اسی وجہ سے یہ کہا گیا کہ اس آیت سے خبرِ واحد کی حجیت بھی ثابت ہوتی ہے۔

دوسرا طریقہ

یہ ہے کہ اس فن کا ماہر عالمِ دین، آیات و روایات میں غور و فکر کرے اصولی و فقہی قواعد کے ذریعے تجزیہ و تحلیل کرنے کے بعد (جسے اجتہاد کہا جاتا ہے) جس نتیجے پر پہنچے اس کو فتویٰ کی صورت میں دوسروں کو سپرد کرے۔ جیسا کہ آئمہ ھدیٰؑ کے بعض شاگرد بھی ایسے ہی تھے اور بارہویں امامؑ کی غیبت سے لوگوں کو احکامِ دین پہنچانے کا یہی طریقہ علماء نے اختیار کر رکھا ہے۔

لہٰذا یہ آیت نقلِ روایت کے حجت ہونے کو بھی اور مجتہد کے فتویٰ کے حجت و معتبر ہونے کو بھی ثابت کر رہی ہے۔

احادیث سے ثبوت

حدیث (۱)

احمد ابن عباس نجاشی نے رجالِ نجاشی، میں ابان ابن تغلب سے مروی امام محمد باقرؑ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

"یا ابان اجلس فی مسجد المدینته وافت الناس فانی احب ان یریٰ فی شیعتی مثلک."

(ترجمہ): اے ابان کوفہ کی مسجد میں جا کر بیٹھ جاؤ اور لوگوں کو فتویٰ دو میں اپنے شیعوں میں تم جیسے فتویٰ دینے والے لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔

ابان جو مجتہد اور صاحب فتویٰ تھے امامؑ نے انہیں فتویٰ دینے کا حکم صادر فرمایا تاکہ لوگ سنیں اور اس پر عمل کریں۔ امامؑ کی نگاہ میں تمام مجتہدین اور صاحبانِ فتویٰ ابان کی طرح ہیں۔ یعنی حکم امامؑ کے مطابق ہر شخص کے لئے جو خود مجتہد نہیں ہے ضروری ہے کہ وہ اپنے موردِ ابتلاء مسائل میں کسی مجتہد کی تقلید کرے اور اس کے فتوؤں پر عمل کرے۔

اپنی تقلید نہ کروایئے

اب اگر کوئی مجتہد فتویٰ دیتا ہے تو گویا وہ امامؑ کے حکم پر عمل کرتا ہے کیونکہ امامؑ نے وافت الناس (تم فتویٰ دو) کہا اور یہ بھی کہا کہ (فانی احب ان یریٰ فی شیعتی مثلک) کہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ میرے شیعوں میں تم جیسے لوگ ہوں۔ اور جو لوگ اس کا فتویٰ سن کر اس کی بات پر عمل کرتے ہیں وہ بھی امامؑ ہی کے قول پر عمل کر رہے ہیں۔ کیونکہ امامؑ کا یہ کہنا کہ اس پر عمل کریں۔ وافت الناس (لوگوں کو فتویٰ دو) اسی بناء پر تھا کہ لوگ فتویٰ سن کر اس پر عمل کریں۔ لہٰذا جو شخص بھی فتویٰ دیتا ہے وہ قولِ امامؑ پر عمل کرتا ہے اور جو شخص بھی فتویٰ سن کر عمل کرتا ہے وہ بھی قولِ امامؑ ہی پر عمل کرتا ہے۔ اب جو شخص بھی اجتہاد و تقلید کے خلاف ہے وہ گویا امامؑ کے قول کے مقابلے میں لوگوں کو اپنے قول پر عمل کرنے کی دعوت دے رہا ہے کہ امام معصومؑ تو کہہ رہے ہیں کہ اجتہاد و تقلید کرو اور وہ کہہ رہا ہے کہ میری بات مانو اور تقلید نہ کرو۔

حدیث (۲)

شیخ حُر عاملیؒ نے، وسائل الشیعہ، باب نمبر ۱۱ جلد نمبر ۱۴ کتاب القضا میں امام جعفر صادقؑ کی ایک روایت معاذ کے واسطے سے نقل کی ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے معاذ سے فرمایا:

بلغنی ان تقعدو فی الجامع وتفتی فیه.

یعنی معاذ ہم نے سنا ہے کہ تم مسجدوں میں جا کر لوگوں کو فتوی دیتے ہو۔

معاذ نے فرمایا: جی ہاں۔ جو کچھ میں نے آپ سے حاصل کیا ہے وہ آپ کے ماننے والوں کو بیان کر دیتا ہوں۔

تو امام نے معاذ کی تائید کرتے ہوئے فرمایا: (**فقال لی اصنع کذا**). ہاں ایسا ہی کیا کرو۔

معاذ روایات معصومینؑ سے استنباط کر کے حکم الہی فتوی کے صورت میں لوگوں کو بیان کرتے تھے۔ امامؑ نے بھی معاذ کے اس عمل کی تائید فرمائی۔ امامؑ کی نظر میں معاذ اور دوسرے مجتہدین یکساں ہیں۔ یعنی مجتہدین کا فتوی لوگوں کے لئے حجت ہے اور اس پر عمل ضروری ہے۔

حدیث (۳)

شیخ حُر عاملیؒ نے وسائل الشیعہ، باب نمبر ۱۱ کتاب القضا میں نقل کیا ہے کہ:

"عبدالعزیز نامی ایک شخص امام رضاؑ کی خدمت آیا اور عرض کی یا حضرتؑ میرا گھر بہت دور ہے میں اپنے مورد ابتلاء مسائل پوچھنے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکتا کیا آپ یونس ابن عبدالرحمٰن کی تائید کرتے ہیں اور میں اپنے دینی مسائل کا حل ان سے حاصل کر سکتا ہوں؟ امام رضاؑ نے فرمایا۔ ہاں۔"

حدیث (۴)

یہ روایت ایک توقیع مبارک ہے جسے شیخ صدوقؒ نے "اکمال الدین و اتمام النعمہ" میں اسحاق ابن یعقوبؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ (بحوالہ وسائل الشیعہ جلد نمبر ۱۸ صفحہ ۱۰۱)

اسحاق ابن یعقوبؒ کہتے ہیں کہ میں نے محمد ابن عثمان العمریؒ کے ذریعے حضرت حجتؑ کی خدمت میں ایک خط لکھ کر کچھ مشکل مسائل کا حل دریافت کیا تو حضرت حجتؑ نے اپنے قلم سے اس خط کا جواب تحریر کیا کہ:

"فاما الحوادث الواقعه فارجعو فیها الیٰ رواة احادیثنا فانهم حجتی علیکم وانا حجة اللّٰه."

"حوادثِ واقعہ میں تم ہماری حدیث کے راویوں کی طرف رجوع کرو کیونکہ وہ لوگ میری طرف سے تمہارے اوپر حجت ہیں اور میں خدا کی طرف سے ان پر حجت ہوں۔"

حوادثِ واقعہ سے کیا مراد ہے؟

ان سے مراد احکام و مسائل شرعیہ تو ہیں ہی کیونکہ شیعوں کے نزدیک یہ کوئی نئی بات تو نہ تھی اور اس پر متواتر روایات بھی موجود ہیں کہ مسائل شرعیہ میں فقہاء کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور آئمہؑ کے زمانے میں بھی شیعہ مسائل شرعیہ میں بحکم امام فقہاء ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ لہٰذا حضرت حجتؑ کے دورِ غیبتِ صغریٰ میں نوابین اربعہ سے رابطہ رکھنے والے اور حضرت حجتؑ کو خط بھیجنے والے بھی یہ جانتے تھے کہ مسائل شرعیہ میں کس طرف رجوع کرنا چاہیے۔ لہٰذا حوادثِ واقعہ سے مراد دورِ غیبت میں پیش آنے والے انفرادی و اجتماعی امور اور سماجی معاملات بھی ہیں جن کے بارے میں امامؑ سے سوال کیا گیا ہے اور انہی کے بارے میں حضرت حجتؑ نے جواب دیا۔

سوال بطور کلی تھا اور اصولی تھا کہ جب ہم آپ تک نہیں پہنچ سکتے اور آپ سے براہِ راست اپنے مسائل کا حل نہیں دریافت کر سکتے تو ہم کیا کریں؟ بہر حال سوال اصولی تھا تو امامؑ نے بھی جواب اصولی دیا کہ حوادث و مشکلات میں ہمارے رواۃ

حدیث یعنی فقہاء کی طرف رجوع کرو کیونکہ وہ لوگ میری طرف سے تم پر حجت ہیں۔
(بحوالہ حکومتِ اسلامی۔امام خمینیؒ)

حدیث (۵)

یہ روایت شیخ صدوق ؒ نے ۴ معتبر طریقوں سے حضرت امیر المومنینؑ سے نقل کی ہے کہ جناب امیرؑ فرماتے ہیں کہ پیغمبرِ اسلام نے ۳ مرتبہ فرمایا (اللّٰھم ارحم خلفائی) پروردگار میرے خلفاء پر رحم فرما۔ حضورؐ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ آپؐ کے خلفاء و جانشین کون لوگ ہیں؟ تو حضورؐ نے فرمایا وہ لوگ جو میرے بعد آئیں گے اور میری حدیث وسنت نقل کریں گے اور (فیعلمو نھا الناس من بعدی) اسے میرے بعد لوگوں کو یاد کرائیں گے یعنی (پڑھائیں گے)۔
(بحوالہ جامع الاخبار۔شیخ صدوقؒ عیون الاخبار الرضاؑ۔شیخ صدوقؒ مجالس)۔

حدیث (۶)

جیسا کہ ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:
''میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کے مثل ہیں''۔

حدیث (۷)

''میں قیامت کے دن اپنی امت کے علماء پر فخر کروں گا، میری امت کے علماء مجھ سے پہلے والے انبیاء کے مثل ہیں''۔رسولؐ خدا (جامع الاخبار)

ظاہر ہے کہ ان تمام روایات سے علمائے امت مراد ہیں نہ کہ آئمہ طاہرینؑ ورنہ ہمیں مذہب شیعہ کے اس مسلمہ عقیدہ سے دستبردار ہونا پڑے گا کہ ہمارے تمام آئمہؑ حضرت رسول اکرمؐ کے سوا تمام انبیاء و مرسلینؑ سے افضل ہیں۔لہٰذا یہ کہنا کہ آئمہؑ انبیاء کے وارث ہیں اور لوگوں کو آئمہؑ سے علم اور احادیث کو حاصل کرنا چاہیئے نہ کہ علماء سے تو

یہ درست نہیں ہے۔ مزید یہ کہ آئمہ کے فضائل و مناقب کے بارے میں جو احادیث پیغمبرؐ سے وارد ہوئی ہیں وہ صاف اور صریح الفاظ میں نام بنام وارد ہوئی ہیں، زمانہ پیغمبرؐ میں تقیہ کا کوئی محل بھی نہ تھا کہ رسول کنایہ واستعارہ سے کام لیتے۔ علمائے امت کی فضیلت میں وارد حدیثوں اور آئمہ کی فضیلت میں جو احادیث ہیں ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لہٰذا ارحم خلفائی اور فیعلمونہا الناس من بعدی اور اس کے بعد کی روایات میں علماء ہی کو مراد لیا گیا ہے۔ اور خصوصاً فیعلمو الناس. وہ لوگوں کو احکام سکھائیں گے، کتاب وسنت کی تعلیم دیں گے۔ اس سے خود ان کے اجتہاد اور لوگوں کو ان سے مسائل کی تعلیم لینے کی طرف ہدایت کی گئی ہے۔

حدیث (۸)

عمر ابن حنظلہ روایت کرتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

''جو ہماری حدیثوں کی روایت کرتا ہو اور ہمارے حلال وحرام میں گہری نظر رکھتا ہو اور ہمارے احکامات سے واقف ہو تو اس کا حکم ماننے پر راضی ہو جاؤ اس لئے کہ ہم نے انہیں تم پر حاکم بنایا ہے اور اگر وہ کوئی حکم دے اور اسے کوئی قبول نہ کرے تو اس نے خداوند عالم کے حکم کو حقیر سمجھا اور ہماری بات اور حکم کو ٹھکرا دیا اور جس نے ہمارے حکم سے سرکشی کی تو اس نے خدا سے سرکشی کی اور خدا سے سرکشی کرنا کفر وشرک ہے۔''

(بحوالہ (۱) فرائد الاصول باب تعادل وتراجح از شیخ مرتضیٰ انصاریؒ

(۲) وسائل الشیعہ جلد نمبر ۱۸ باب نمبر ۱۱ ابواب صفات القاضی روایت اول صفحہ ۹۸

(۳) حلیۃ الاولیاء، جلد نمبر ۳ صفحہ ۱۹۶ (۴) الامام الصادقؑ جلد نمبر ۳ صفحہ ۳۲

(۵) نہج المقال صفحہ ۸۶

اب ملّتِ اسلام کی ذمہ داری کیا ہے، اپنے مسائل کے حل کے لئے وہ کس کی

طرف رجوع کریں؟ معصومؑ نے فرمایا کہ اختلافات میں جو لوگ "حسب قواعد حلال و حرام کو جانتے ہیں، میزان عقلی و شرعی سے ہمارے احکام کی معرفت رکھتے ہیں، ہمارے ان روایات حدیث کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔" امامؑ نے واضح طور پر فرمادیا تا کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ محدثین بھی مرجع اور حاکم ہیں۔ کیونکہ صرف حدیث کو نقل کرنا اور بات ہے اور قواعدِ حلال و حرام کا جاننا، احکام کی معرفت، اصول کا عالم ہونا، تقیہ اور خلاف واقعہ روایات کا عارف ہونا اور بات ہے۔

ہم نے انہیں تم پر حاکم بنایا ہے، تو اب امامؑ کے حکم کی وجہ سے ہمیں ہر مسئلے کے حل کے لئے ان کے پاس جانا ہوگا اور جو ان مراجع کی طرف جانے سے روکے گا وہ امامؑ کے مقابلے میں گویا اپنے حکم کو ماننے کی دعوت دے رہا ہے۔

حدیث (۹)

اور مستدرک میں بھی غرر کے حوالے سے یہ روایت ہے کہ "العلماء حکام علی الناس" (علماء لوگوں پر حاکم ہیں)۔

حدیث (۱۰)

وسائل الشیعہ باب نمبر ۱۰ کتاب القضا میں شیخ حُر عاملیؒ نے امام حسن عسکریؑ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ جس میں امامؑ نے فرمایا:

"فاما من کان الفقهاء صائناً لنفسه حافظاً لدینه مخالف الهواه ومطیع الامر مولاه O فللعوام ان یقلدوه.

فقہاء میں سے جو شخص بھی اپنے نفس کو بچاتا ہو، دین کی حفاظت کرتا ہو، خواہشات نفسانی کی مخالفت کرتا ہو، اپنے پروردگار کا مطیع و فرمانبردار ہو پس عوام کے لئے لازم ہے کہ اس کی تقلید کریں۔

اعتراضات

اور ان کا

تجزیہ

اعتراض (۱)

بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ تقلید کے حرام ہونے پر کئی آیات وروایات ہیں جیسا کہ سورہ زخرف آیت نمبر ۲۳ میں کفار کا قول خدا نے نقل کر کے تقلید کی مذمت کی ہے کہ۔

(انا وجدنا اٰباءَ نا علیٰ اُمّۃٍ وانا علیٰ اٰثٰرھم مقتدون O)

''ہم نے اپنے آباء واجداد کو ایک طریقے پر پایا اور ہم بھی ان کی اتباع کریں گے۔''

جواب

(۱) اولاً تو یہ آیات کفار سے متعلق ہیں چونکہ کفار پیغمبر خدا کے خلاف ہونے اور اپنی بُری اور فاسد عادات کی پیروی کرنے کے علاوہ انبیاء کے معجزات اور دلائل کے مقابلے میں اپنے آباء واجداد کے غلط عقائد اور طریقوں کی اتباع کرتے تھے اور یہ بات واضح ہے کہ ان کے آباؤ اجداد بھی انہی کی طرح جاہل و نادان تھے، پس درحقیقت اس آیت شریفہ میں جاہلوں اور نادانوں کی تقلید سے روکا گیا ہے اور مذمت کی گئی ہے نہ کہ صاحبان علم وفضل کی تقلید سے۔

دوسری بات یہ کہ ان آیات میں اصول دین میں تقلید کی مذمت واضح ہوتی ہے۔ جیسا کہ بعض روایات سے بھی ثابت ہے جیسا کہ شیخ مفیدؒ نے اپنی کتاب ارشاد، میں (ترجمہ از چہاردہ معصومؑ جواد فاضل صفحہ ۱۸۶) ایک روایت میں امام صادقؑ کے مخلص صحابی ہشام بن سالم کے حوالے سے نقل کی ہے کہ:

''جب منصور کے زمانے میں امام صادقؑ کی شہادت کے بعد اس وقت کے شیعہ اپنے رہبر وامام صادقؑ کے وارث کو پہچاننے کی فکر میں تھے تا کہ ان سے اپنے

عہد کی تجدید کریں۔ تو جب ہشام بن سالم امام حق موسیٰ کاظمؑ کی خدمت میں پہنچے تو ان سے پوچھا۔ فرزندِ رسولؐ آپؑ کے پیشوا کون ہیں؟ امامؑ نے فرمایا میرا کوئی پیشوا نہیں۔ پھر ہشام نے کہا فرزندِ رسولؐ آپ پر قربان! ہم ایسے مکتب و مذہب کے پیروکار ہیں کہ کسی کی اندھی تقلید نہیں کرتے ہم استدلال واحتجاج کے مردمیدان ہیں اور آپؑ کے پدر بزرگوار نے ہماری اسی طرح تربیت کی ہے، اجازت ہے کہ آپؑ سے کچھ سوال کروں؟ امامؑ نے فرمایا، جو پوچھنا چاہتے ہو پوچھو!۔۔۔الخ (اور پھر ہشام نے سوالات کئے اور امامؑ نے جوابات دیئے)"۔

اس روایت میں ہشام کا یہ کہنا کہ ہم کسی کی تقلید نہیں کرتے امامت سے متعلق تھا جو کہ اصول دین میں ہے اور اس میں تقلید نہیں ہوتی اور دلیل کی ضرورت پڑتی ہے جبھی ہشام نے دلیل بھی طلب کی اس کے مقابلے میں فقہی احکامات میں تقلید کی جتنی روایات ہیں ہمیں کہیں یہ نہیں ملتا کہ امامؑ نے دلیل مانگنے کا حکم دیا ہو بلکہ مطلق حکم ہے کہ (فللعوام انْ یقلدوہ) عوام کے لئے لازم ہے کہ وہ ایسے مجتہدین کی تقلید کریں۔

ورنہ امامؑ کے لئے یہ بات لازم تھی کہ ان تمام روایات میں یہ شرط ضرور لگاتے کہ فقہاء و مجتہدین سے دلیل ضرور طلب کریں۔

اعتراض (۲)

یہ مجتہدین یہ چاہتے ہیں کہ مقلدین کی طاقت ان کے ہاتھ میں رہے یعنی وہ طاقت کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں، وہ مال کے حریص ہیں اور اس سلسلے میں ایک روایت بھی ہے جو کہ وسائل الشیعہ باب نمبر ۱۰ کتاب القضا میں سفیان سے مروی ہے کہ امام صادقؑ نے سفیان بن خالد کو فرمایا: اے سفیان! ریاست سے بچ چونکہ جو بھی

ریاست وجاہ طلبی کے پیچھے پڑا وہ ہلاک ہوا۔ سفیان کہتے ہیں کہ میں نے عرض کی یا حضرت! پس ہم سب ہلاکت میں ہیں کیونکہ ہم میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ لوگوں میں اس کا نام لیا جائے اور لوگ اس کے پاس آ کر علم حاصل کریں۔ (اور اس کی تقلید کریں)

جواب (۱)

اس روایت کو آدھا نقل کرنا اس روایت سے سوئے استفادہ ہے کیونکہ اس کے بعد امامؑ نے فوراً کہا۔

''میرا مقصد یہ نہیں جو تو نے سمجھا ہے بلکہ اس مذمت سے میرا مطلب یہ ہے کہ تو کسی کو معصومؑ کی تائید کے بغیر نصب کر کے ہر موضوع میں اس کی گفتار کی تصدیق اور لوگوں کو اس کی بات کی طرف دعوت دے۔''

جواب (۲)

امام صادقؑ اس روایت میں فرماتے ہیں کہ لوگ خود کسی کو مقام فتویٰ اور قضاوت کے لئے مقرر نہیں کر سکتے اور لوگوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے بلکہ مجتہد اور قاضی امامؑ کی طرف سے منسوب ہوتے ہیں اور خود امامؑ نے ان کے فتویٰ کو معتبر قرار دیا ہے جیسا کہ پیچھے کی روایات میں امامؑ نے فرمایا:

(۱) یا ابان ... (وافت الناس) (لوگوں کو فتویٰ دو)

(۲) فللعوام ان یقلدوه (لوگوں پر لازم ہے کہ تقلید کریں)

(۳) ہم نے فقہاء کو تم پر حاکم مقرر کیا ہے

(۴) ہم نے فقہاء کو تم پر قاضی مقرر کیا

پس امام کا مجتہد و فقیہہ کی تقلید کرنا خود امامؑ کے حکم کی وجہ سے ہے نہ کہ عوام نے

خود ہی کسی غیر مجتہد کو نصب و مقرر کیا ہو۔

جواب (۳)

اسی روایت میں امام کا جملہ یہ ہے کہ (ایاک ان تنصب رجلاً دون الحجۃ) یعنی حجت سے مراد وہ ہے کہ جس کا قول شرعاً نافذ ہو پس اس بناء پر مجتہد بھی حجت ہے لیکن امامؑ خدا کی طرف سے حجت ہیں اور مجتہد امامؑ کی طرف سے حجت ہے۔

یعنی اگر ان مجتہدین و فقہاء کی پیروی کے لئے احادیث نہ ہوتیں اور ہم خود ہی ان کی اتباع و پیروی شروع کر دیتے تو یہ حرام ہوتا۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ تقلید کرنے والا (مقلِد) بھی خود ہی حُجت (یعنی مجتہد) کو معین نہیں کرتا بلکہ امامؑ کی طرف سے منصوب حجت کی طرف رجوع کرتا ہے۔

جواب (۴)

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مجتہد اور مرجع (جس کی طرف لوگ رجوع کریں) ہو الگ مطلب ہے اور کسی کو حجت قرار دینا الگ ہے۔ پہلی صورت جائز اور دوسری صورت حرام ہے۔ کیونکہ راوی یہ عرض کرتا ہے کہ یا حضرتؑ ہماری یہ خواہش ہے کہ لوگ ہمارے پاس آئیں اور علم حاصل کریں آپؑ فرماتے ہیں کہ میں اس کی مذمت نہیں کرتا بلکہ میری مذمت اس صورت میں ہے کہ جب تم کسی کو حجت کے عنوان سے مقرر کرو گے (یہاں یقیناً کسی کو مقرر کرنے سے مراد مسئلہ تقلید اور تحصیل علم کے علاوہ ہے) یعنی حضرتؑ نے ان لوگوں کی مذمت فرمائی جو آئمہؑ ھدیٰ (جو رسولؐ کی طرف سے منصوب ہیں) کے مقابلے میں بنی امیہ و بنی عباس کو اولی الامر اور حجت سمجھتے ہیں جو کہ پیغمبرؐ اور ان کی پاک و طاہر اولاد کو چھوڑ کر بنی اُمیہ و بنی عباس کو

اولی الامر اور حجت سمجھتے ہیں اور انہی کی پیروی کرتے ہیں جن کے بارے میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

جواب (۵)

اس روایت میں امامؑ یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ جائز ہے کہ جو کچھ وہ کہے اس کی تصدیق کرو اور اس کی پیروی کرو۔

اس بات کا مسئلہ تقلید سے کوئی ربط نہیں ہے کیونکہ مقلِّد اپنے مجتہد کی ہر بات میں تقلید اور پیروی نہیں کرتا مثلاً اصول دین میں تقلید نہیں ہوتی اور فروع دین میں بھی، ضروریات اور قطعیات میں تقلید نہیں ہوتی مثلاً خود نماز، روزہ، زکوۃ، خمس و جہاد کے واجب ہونے یا مثلاً شراب، جوا، مردار، غصب وظلم کے حرام ہونے میں جو دین اسلام میں سب کے لئے قطعی و مسلّم ہیں، تقلید درست نہیں ہے۔ اگر کوئی مجتہد یہ کہے کہ نماز واجب نہیں ہے یا شراب نوشی جائز ہے تو اس کی بات بھی قابل قبول نہ ہوگی۔ اسی طرح موضوعاتِ خارجی میں بھی تقلید نہیں ہوتی۔ یعنی مجتہد یہ کہے کہ یہ پانی ہے شراب نہیں ہے تو اب اس کی ہر بات پر عمل کرنا واجب ولازم نہیں ہے بلکہ ایسے مسائل میں مجتہد اور دیگر افراد میں کوئی فرق نہیں ہے سب یکساں ہیں بلکہ ان میں مجتہد خود اکثر اہلِ فن کا محتاج ہوتا ہے۔

حکم تقلید عقلی ہے

حکم عقلی بھی ہے، تقاضائے فطرت بھی یہی ہے اور روش وطریقۂ عقلاء بھی یہی ہے کہ مثلاً کوئی مریض اگر خود اپنے مرض اور اس کی دوا تشخیص نہ کرسکتا ہو اور اس کے لئے دوسروں کا محتاج ہو اور دوسروں کی طرف رجوع کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ ہو تو اس کی عقل یہ فیصلہ کرے گی کہ اسے ڈاکٹر کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور ڈاکٹر جو

علاج تجویز کرے اس پر عمل کرنا لازم ہے۔ اگر ڈاکٹر کے موجود ہوتے ہوئے اس کی طرف رجوع نہ کرے اور خود کتابیں ٹٹول کر اس میں سے اپنے لئے دوا تجویز کرے جبکہ وہ خود اہل فن نہ ہو اور اس کی وجہ سے اس کا مرض بڑھ جائے یا اسے موت آجائے تو عقلاء اس کی مذمت کریں گے اور اس کا کوئی عذر قبول نہ کریں گے۔ اب جبکہ مریض یہ سمجھ کر کہ ڈاکٹر کی تشخیص، بیماری کے اسباب اور اس کے علاج کے طریقے اس کی قدرت وطاقت سے باہر ہیں ڈاکٹر سے اپنے علاج کی دلیل طلب کرے تو یہ مورد تنقید واقع ہوگا۔ یعنی عقلاء بھی اس کے اقدام کی مذمت کریں گے۔ یعنی اس میں دلیل طلب کرنا عقل کے خلاف ہوگا۔

اعتراض (۳)

اب اس مثال میں کچھ افراد یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ جو آپ ڈاکٹر کی مثال تقلید کے لئے پیش کرتے ہیں تو ڈاکٹر کی مثال اور مجتہد کی مثال میں فرق ہے۔ ڈاکٹر تو ہم دوران علاج بدل بھی سکتے ہیں۔ لیکن جس مجتہد کی ہم تقلید شروع کردیں اس کی موت تک ہم اس کی تقلید سے باہر نہیں آسکتے۔

جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر دنیا کا سب سے بڑا اور بہترین ڈاکٹر صحیح علاج کر رہا ہو اور اس کے صحیح علاج کے دوران ہی اگر ہم اس ڈاکٹر کو چھوڑ کر کسی اور ڈاکٹر کی طرف رجوع کرلیں تو تمام عقلاء ہماری مذمت کریں گے۔ البتہ اگر وہ ڈاکٹر ہی صحیح نہ ہو تو پھر آپ کی پہلی تحقیق ہی غلط تھی کہ وہ سب سے بڑا ڈاکٹر ہے اور اسے چھوڑ دینا عقلاً صحیح ہوگا یا اگر وہ علم کے اعتبار سے بڑا ڈاکٹر تو ہے لیکن وہ علاج میں سستی، لاپرواہی یا نظراندازی کا مظاہرہ کرے، جسے میڈیکل Ethics میں حرام کہیں گے اس کی

عدالت ختم ہو جائے گی تو اس کو بدلنا ضروری ہوگا۔ تو اب یہ قانونِ عقلی تو ہماری فقہ میں بھی جاری و ساری ہوتا ہے کہ اگر مجتہد ان اصولوں کی پابندی نہ کرے جس کی پابندی کرنے پر ہی امامؑ نے اس کو قابلِ تقلید ٹھہرایا تھا۔ یعنی اگر مجتہد کوئی گناہ کرے تو اس کی عدالت ختم ہو جائے گی اور اس کو بھی چھوڑ دینا واجب ہوگا۔ خلافِ عقل وخلافِ شرع تو اس وقت ہوتا ہے کہ جب مجتہد کی عدالت بھی ختم ہو جاتی اور پھر بھی ساری زندگی اس کی تقلید میں باقی رہنے کا حکم دیا جاتا۔ جبکہ ایسا نہیں ہے۔ تو دنیا کے سب سے بڑے ڈاکٹر اور دنیا کے سب سے بڑے عالم کی مثال میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ جیسا کہ کچھ افراد نے اس مثال میں شبہ کا اظہار کیا ہے۔

اور ویسے بھی قانون ہے کہ مثال میں کوئی جھگڑا نہیں کرنا چاہیئے۔ مثال تو صرف بات کو سمجھانے کے لئے دی جاتی ہے۔ مثال میں تمام جہتوں کا آنا لازم بھی نہیں ہوتا۔

اعتراض (۴)

کچھ افراد کی طرف سے یہ اعتراض بھی ہے کہ شیخ نجم الدین ابوالقاسم جو کہ المحقق کے نام سے مشہور ہیں، وہ پہلے آدمی ہیں کہ جنہوں نے تقلید اور تقلید اعلم کے نظریے کو رائج کیا اور ان کے بعد کے سب علماء جو تقلید کے قائل ہیں وہ سب المحقق ہی کے نظریے کے پیروکار ہیں۔ المحقق ۶۰۲ھ میں پیدا ہوئے ان سے پہلے تقلید اور تقلید اعلم رائج ہی نہ تھی اور یہ بات ایک تاریخی حقیقت ہے۔

جواب

تاریخی حقیقت تو یہ ہے کہ اجتہاد و تقلید کا حکم تو امامؑ کے زمانے ہی سے شیعوں میں رائج تھا۔ آئمہؑ تقلید کے مکتب یا نظام کو خود قائم کر کے گئے تھے۔ جیسا کہ پچھلے دلائل

سے ثابت ہے کہ خود چھٹے امامؑ نے ابان کو وافت الناس کہہ کر فتویٰ دینے کا حکم دیا بلکہ یہ بھی کہ میں آئندہ بھی اپنے شیعوں میں تم جیسے فتویٰ دینے والوں لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ یہ فتویٰ دینے کا حکم صرف ابان ہی کے لئے نہیں تھا بلکہ لوگوں کے لئے بھی یہ پیغام تھا کہ ان کے فتویٰ کے پیروی کرنا۔ یا امام حسن عسکریؑ کا یہ کہنا (فللعوام ان یقلدوه) ''عوام کے لئے لازم ہے کہ وہ مجتہد کی تقلید کریں،، یا امام زمانہؑ کی توقیع کہ (فارجعو فیھا الیٰ رواۃ احادیثنا) ''میری حدیثوں کے راویوں کی طرف رجوع کرنا یا معاذ ابن جبلؓ کے اجتہاد پر رسولؐ خدا کی پسندیدگی کا اظہار جس روایت کو شیخ الطائفہ ابوجعفر طوسیؒ نے اپنی کتاب العدہ فی اصول الفقہ میں نقل کیا ہے کہ:

''جس وقت پیغمبر اسلامؐ نے اپنی طرف سے معاذ ابن جبلؓ کو یمن بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو حضرتؐ نے ان سے پوچھا کہ حکومت کرنے میں تمہاری روش و طریقہ کیا ہوگا؟ تو معاذ نے عرض کیا کہ کتابِ خدا و سنتِ رسولؐ کے مطابق عمل کروں گا تو حضرتؐ نے فرمایا جس مسئلے میں تمہیں میرا حکم نہیں ملے گا تو کیا کروگے؟ معاذ نے عرض کیا کہ میں اس وقت اجتہاد کروں گا اور انتہائی کوشش کروں گا کہ میرا فیصلہ روحِ احکامِ خدا کے مطابق ہو۔ یہ سن کر حضرتؐ نے معاذؓ کی تعریف کی اور ان کی تصدیق فرمائی۔،،

احادیث و روایات سے قطع نظر اگر ہم تاریخ پر بھی نگاہ ڈالیں تو بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نہ صرف تقلید بلکہ تقلیدِ اعلم، غیبت کبریٰ کی شروعات ہی سے رائج رہی ہے۔ بارہویں امامؑ کی غیبت کبریٰ سے بالکل متصل زمانہ ہمارے متقدمین علماء کا زمانہ ہے اس میں بھی سید مرتضیٰؒ جو علم الہدیٰ کے لقب سے مشہور ہیں، کا اعلمیت کا قول پایا جاتا ہے۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ امام کی غیبت صغریٰ ۳۲۹ھ میں ختم ہوئی اور غیبت کبریٰ شروع ہوئی اور سید مرتضیٰ علم الھدیٰ ؒ کی پیدائش ۳۵۵ھ میں ہوئی اور وفات ۴۳۸ھ میں ہوئی۔ یعنی بارہویں امام کی غیبت کبریٰ کے ۲۶ سال بعد سید مرتضیٰ علم الھدیٰ ؒ پیدا ہوئے اور پھر ان کا نہ صرف یہ کہ اجتہاد و تقلید بلکہ مجتہد اعلم کی پیروی پر فتویٰ تاریخی شہادت دے رہا ہے کہ تقلید اعلم پر غیبت کبریٰ کے اوائل ہی سے عمل کیا جاتا رہا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ المحقق نے سب سے پہلے تقلید کے اس Institution کو قائم کیا جن کی پیدائش ہی ۶۰۲ھ ہے، تاریخی اعتبار سے غلط ہے۔ اور المحقق کے تقلید کے مسئلے میں کسی کردار کی جو بات سید امیر علی کے حوالے سے دیتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ شیعی نقطہ نظر کو ثابت نہیں کرتے بلکہ تاریخی اعتبار سے بھی سید مرتضیٰ علم الھدیٰ ؒ کا تقلید کے لئے اعلمیت کا فتویٰ ان کی تحقیق کو غلط ثابت کرتا ہے۔

البتہ تقلیدِ اعلم کے مسئلے میں علماء میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ آیت اللہ العظمیٰ آقائے السید ابوالقاسم الموسوی الخوئیؒ نے اپنے درسِ خارج میں یہ بیان بھی کیا ہے کہ ہمارے متقدمین علماء، جن کا زمانہ، غیبت کبریٰ کے اوائل سے بالکل متصل ہے ان میں اعلمیت کا قول پایا جاتا ہے۔ یہ قول متاخرین علماء میں ضعیف ہو گیا اور پھر متاخر المتاخرین علماء میں یہ قول پوری شدومد کے ساتھ دوبارہ آیا۔

تاریخ سے تو یہ بھی ثابت ہے کہ اہل سنت کے یہاں چوتھی صدی ہجری یا اس کے بعد اگر کوئی مجتہد پیدا ہوا تو اس کی پیروی یا تقلید نہیں کی گئی لیکن اس سے پہلے جتنے بھی مجتہدین ہوئے وہ سب اپنے پیروکار و مقلدین رکھتے تھے۔ یعنی یہ صرف فقہ شیعہ ہی نہیں کہ جس میں تقلید کا رواج تھا بلکہ چوتھی صدی ہجری سے پہلے تک اہل سنت میں بھی اجتہاد و تقلید ہوتی تھی اگرچہ بعد میں انہوں نے تقلید کو ۴ اماموں (ابو حنیفہ، شافعی،

مالک، احمد ابن حنبل) میں محدود کر دیا۔

کچھ لوگوں نے تقلید کرنا کب چھوڑی؟

لہٰذا اب سوال یہ نہیں ہے کہ اجتہاد و تقلید شیعت میں کب سے ہے؟ وہ تو ثابت ہو چکا کہ زمانہ رسولؐ خدا، زمانہ آئمہؑ اور زمانہ غیبت کبریٰ سے لے کر آج تک جاری و ساری ہے بلکہ سوال تو یہ ہے کہ آخر چند افراد جن کے چند پیروکار آج بھی اجتہاد و تقلید سے روگردانی کا نعرہ بلند کر رہے ہیں۔ انہوں نے کب شیعت کے اس مسلم اصول کو چھوڑا؟

تاریخ سے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اجتہاد و تقلید سے لوگوں کو سب سے پہلے ہٹانے والے اخباری مذہب کے بانی ملا محمد امین استر آبادی تھے۔ جنہوں نے ۱۱ویں صدی ہجری کے اوائل میں اپنی کتاب فوائد المدینہ میں اپنے اجتہاد و تقلید کے خلاف نظریات کو سب سے پہلے ظاہر کیا ہے۔ بہتر ہے کہ اجتہاد و تقلید سے روگردانی کرنے والے اس شیعہ فرقے کے متعلق گفتگو ہم شہید مطہریؒ کے حوالے سے نقل کریں۔ جس کو آقائے محمد عقیق بخشائش نے اپنی کتاب امام صادقؑ پیشوا اور رئیسِ مذہب میں نقل کیا ہے۔

آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہریؒ فرماتے ہیں کہ

"بہت تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ گیارہویں صدی ہجری کے اوائل میں شیعوں کے درمیان ایک نئے مسلک کا ظہور ہوا جو ظاہری اور حنبلی مسلک سے بھی زیادہ جامد اور خشک تھا۔ یہ اخباری مسلک شیعت کی دنیا کا ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ جس کے کم و بیش آثار اب بھی پائے جاتے ہیں اور جو شیعی معاشرے کے جمود کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ اخباری مذہب کے بانی ملا محمد امین استر آبادی تھے ان کی مشہور

کتاب جوان کے عقائد و نظریات کو واضح کرتی ہے وہ فوائد مدینہ ہے۔ امین استر آبادی مطلقاً اجتہاد و تقلید کا انکار کرتے تھے بلکہ اجتہاد و تقلید کو دین کے لئے بدعت سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ کوئی شخص امام معصومؑ کے علاوہ کسی کی تقلید کا حق نہیں رکھتا۔ مرزا امین استر آبادی اور ان کے پیروکاروں کا یہ دعویٰ ہے کہ ان کا مذہب وہی ہے جو قدیم شیعوں کا ہے اور یہ کہ شیخ صدوقؒ کے زمانے تک شیعہ اخباری مسلک رکھتے تھے۔ (یعنی اجتہاد و تقلید نہیں کرتے تھے) اور رفتہ رفتہ ابن ابو عقیلؒ، ابن جنیدؒ، شیخ مفیدؒ، شیخ مرتضیٰؒ اور شیخ طوسیؒ کے ذریعے لوگ راستے سے منحرف ہوتے گئے اور احکام الٰہی میں اجتہاد و تعقل کو داخل کر دیا،،

اس کے بعد شہید مطہریؒ فرماتے ہیں کہ:

''حقیقت یہ ہے کہ اخباریت، کبھی بھی اپنے معین اصول مثلاً غیر معصومؑ کی تقلید کا جائز نہ ہونا اور دلیل کا حجت ہونا جیسے اصولوں کے ساتھ ایک مکتب کی صورت میں ظہور پذیر نہیں ہوتی (یعنی یہ کہا جائے کہ شیخ صدوقؒ اور ان سے پہلے کے علماء اجتہاد و تقلید کے قائل نہ تھے بلکہ اخباری مسلک رکھتے تھے) بلکہ بات فقط اتنی ہے کہ بعض لوگوں کا مشغلہ حدیث بیان کرنا ہوتا تھا اور وہ اپنی کتابوں میں صرف حدیثیں ہی بیان کرتے تھے اور ان کے فتوے اکثر حدیثوں کا موضوع ہوا کرتے تھے۔ احادیث کی کثرت اور آئمہ اہلبیتؑ کے موجود رہنے سے ابھی یہ ضرورت بھی نہ پڑی تھی کہ فروعات میں اجتہاد کیا جائے۔

خوش نصیبی سے مجتہدین اور مسؤلین کے درمیان ایسی قد آور شخصیات وجود میں آئیں جو اخباریوں کے مقابلے میں ڈٹ کر کھڑی ہوگئیں۔ جن افراد نے اخباری فکر کے خلاف سختی سے مقابلہ و مبارزہ کیا ہے ان میں سرفہرست استاد الکل آقائے وحید

بہبہانیؒ اور شیخ مرتضیٰ انصاریؒ کا نام نامی ہے۔ ضمناً یہ بات بھی کہے بغیر نہ رہ جائے کہ اخباریت کے خلاف بڑا ہی سخت مبارزہ تھا۔ اس لئے کہ اخباری مسلک کی ظاہری شکل وصورت، بہت حق بجانب اور عوام فریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امین استر آبادی کے بعد اس مسلک نے تیزی سے رواج پایا۔

اس بیان کے بعد شہید مرتضیٰ مطہریؒ فرماتے ہیں کہ۔

''اخباری (اجتہاد وتقلید کے مخالف) اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرتے ہیں کہ گویا قول وگفتار معصومؑ کے وہی سچے پیروکار ہیں (جبکہ وہ اس سے کوسوں دور ہیں) شیخ مرتضیٰ انصاریؒ اپنی کتاب فرائد الاصول کے مباحث براۃ واحتیاط میں ایک اخباری (اجتہاد وتقلید کے نہ ماننے والے) کا قول نقل کرتے ہیں اور یہ قول بظاہر عوام کو فریب دینے والا ہے کہ قیامت میں عدل الٰہی کے سامنے اگر کوئی اخباری کھڑا کر دیا جائے اور اس سے یہ سوال کیا جائے کہ تو نے دنیا میں کس طرح عمل کیا؟ وہ جواب دے گا معصومؑ کے قول پر عمل کیا اور جہاں قول معصومؑ نہ ملا وہاں احتیاط پر عمل کیا تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے شخص کو جہنم میں دھکیل دیا جائے گا اور دین سے بے پرواہ وہ لا ابالی اشخاص (یعنی مجتہدین ومقلدین) کو جنت میں لے جایا جائے گا۔

''ظاہر ہے کہ ایسے عوام فریب افکار جو شکل وصورت میں حق بجانب معلوم ہوتے ہیں ان کے ساتھ مقابلہ کس قدر دشوار ہے۔ اجتہاد وتقلید کے ذمہ دار افراد نے اس کا جواب اس طرح دیا کہ ہم بھی معصومؑ کے قول واقعی کو تسلیم وقبول کرتے ہیں مگر آپ اخباریوں نے جو امامؑ کے اقوال تسلیم کرنے کا طریقہ اختیار کیا ہے کہ نہ تو صحیح و غلط احادیث میں امتیاز ہے اور نہ ہی کلامِ معصومؑ کی روح میں غور وتفکر۔ حقیقت میں یہ قول معصومؑ کو تسلیم کرنا نہیں بلکہ جہالت کو تسلیم کرنا ہے۔

اس کے بعد شہید مطہریؒ فرماتے ہیں کہ:

''یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ اگرچہ چند رہبرانِ اجتہاد کے مردانہ وار حملوں سے ہی اخباریوں کی صف درہم برہم ہوگئی مگر اخباری گری کی فکر بالکل ختم نہیں ہوسکی۔۔۔ آج بھی بعض جگہ اخباریت کی فکر جمود ہی کی سربراہ ہے اور بعض مطالب ایسے بھی دیکھے جاتے ہیں کہ جو معارف اہل بیتؑ کے نام سے بازار میں سامنے آتے ہیں لیکن حقیقت میں آئمہ اہل بیتؑ کی تعلیمات میں خنجر گھونپ رہے ہیں اور سوائے امین استر آبادی کے بچے کچھے افکار کے علاوہ ان کے پاس اور کچھ بھی نہیں ہے، (شہید مطہریؒ کا بیان ختم ہوا)۔

مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہوا کہ خود شہید مطہریؒ اخباریت (اجتہاد و تقلید سے رو گردانی) کو شیعت کے لئے کتنا بڑا خطرہ شمار کرتے ہیں۔ اگر کہیں شہید مطہریؒ نے جاہلانہ تقلید کی مذمت کی ہے تو شہید مطہریؒ نے یہ باتیں فقہی احکام تقلید کے ضمن اور سلسلے میں نہیں کہی ہیں بلکہ دیگر افکار مثلاً غیر ثابت شدہ امور میں ایسی تقلید کہ جس میں آگہی نہ ہو سکے اور فکری جمود طاری ہو جائے اس کی مذمت کی ہے ورنہ تو خود شہید مطہریؒ کے بیانات اور ذیل میں درج بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خود شہید مطہریؒ احکام فقہی میں کس حد تک بلا سوال، بلا Argument اور بغیر کسی حیل و حجت کے تقلید کے قائل ہیں۔

آقائے شہید مرتضی مطہریؒ اپنی کتاب ''عورت پردہ کی آغوش میں'' صفحہ ۲۳۶ پر پردہ سے متعلق اپنے نظریہ کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ

''ممکن ہے کہ میرا نظریہ غلط ہو۔ میں نے یہ بات بار بار کہی ہے کہ اس قسم کے فروعی مسائل میں ہر شخص کو یہ چاہیئے کہ وہ اپنے مجتہد کے فتووں پر عمل کرے۔

اعتراض (۵)

بہت سے لوگوں کو یہ بھی اعتراض ہے کہ اجتہاد و مرجعیت کا لفظ آئمہؑ کے زمانے میں ہمیں نہیں ملتا یا متقدمین علماء کے دور میں بھی ہمیں کہیں یہ لفظ نظر نہیں آتا۔ لہٰذا یہ بعد کی ایجاد ہے۔

جواب

اس اعتراض کا جواب بھی آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہریؒ نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے جسے ہم محمد عقیق بخشائشی کی کتاب ''امام صادقؑ پیشوا اور رئیس مذہب'' کے حوالے سے نقل کر رہے ہیں۔

شہید مطہریؒ فرماتے ہیں۔

''آج کل ہم شیعوں میں بہت ہی معروف و مشہور لفظ بلکہ مقدس ترین لفظ اجتہاد و مجتہد ہے۔ یہ سن کر تعجب ہوگا کہ یہ لفظ رسولؐ خدا کے زمانہ رحلت سے لے کر مسلسل چند صدیوں تک سُنی تھا۔ اس کے بعد اس لفظ نے اپنے اندر کچھ معنوی تغیر و انقلاب کے بعد شیعت کو اختیار کیا ہے۔''

''اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جو کہ آئمہؑ کے زمانے سے قریب ہے۔ یہ لفظ، اجتہاد ایک خاص مفہوم کا حامل تھا اور آئمہ کے لئے یہ قابل قبول نہ تھا اور لازمی طور پر ان کی تعلیمات میں جگہ نہ پا سکتا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں اجتہاد کے معنی تھے اپنی رائے پر عمل کرنا، نہ کہ خدا کی مقرر کردہ دلیلوں سے حکم شریعت حاصل کرنا یعنی اجتہاد کا مطلب ذاتی رائے پر عمل کرنا ہوتا تھا۔ لیکن بتدریج اس کے معنی و مفہوم میں ایک تغیر پیدا ہوا اور فقہائے عامہ نے اسے دوسرے معنوں میں

استعمال کرنا شروع کر دیا تو اس کے بعد اس لفظ نے قہراً فقہ شیعہ میں اپنا راستہ پیدا کر لیا۔"

امام شافعیؒ نے اپنی کتاب "الرسالہ" میں باب اجماع کے بعد دوسرا باب، الاجتہاد قرار دیا ہے۔ اس کے بعد باب الاستحسان کے عنوان سے تیسرا باب قرار دیا ہے۔ اس کے بعد امام شافعیؒ اپنی بحثوں میں یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ اجتہاد جو شریعت میں جائز سمجھا گیا ہے وہ قیاس میں منحصر ہے، باقی اجتہاد کی دوسری قسمیں مثلاً استحسان وغیرہ پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک قیاس کے جواز کی جو دلیلیں ہیں وہی اجتہاد کے جواز کی ہیں۔

یعنی چوتھی صدی اور پانچویں صدی تک ہم یہ دیکھتے ہیں کہ علماء جب لفظ اجتہاد استعمال کرتے ہیں تو وہ قیاس اور رائے کے مضمون میں استعمال کرتے ہیں مثلاً شیخ ابو جعفر طوسیؒ اپنی مشہور کتاب "عدۃ الاصول" میں ایک موضوع پر بحث کرتے ہوئے قدیم علماء کی طرح جہاں لفظ اجتہاد استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد قیاس لیتے ہیں۔ اس کے بعد ایک دوسرا باب باب الاجتہاد کے نام سے قائم کرتے ہیں اور اس میں اجتہاد سے مربوط مسئلے پر گفتگو کرتے ہیں اور اس کے بعد لکھتے ہیں، قیاس و اجتہاد شرع میں جائز نہیں ہے، شیخ طوسیؒ کی اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے تک ابھی لفظ اجتہاد کا مقصد خاص طور پر رائے اور قیاس تھا مگر تدریجاً اس لفظ نے بہت وسیع معنیٰ و مفہوم پیدا کر لیئے ہیں۔

صدرِ اوّل پیغمبرؐ اور اصحاب کی طرف منسوب حدیثوں کی پیروی کے ساتھ جو لوگ اس لفظ کو استعمال کرتے تھے تو اس سے ان کا مقصد اجتہاد رائے ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ امام غزالی متوفی ۵۰۵ھ اپنی کتاب "المستصفیٰ" میں لفظ اجتہاد کو

بار بار قیاس کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں مثلاً امام غزالی اسی کتاب کی جلد نمبر ۲ صفحہ ۳۵۴ پر فرماتے ہیں کہ:

اختلفو جواز التعبد بالقیاس والاجتہاد فی زمان رسول اللّٰہ.

(اس بات میں اختلاف ہے کہ قیاس واجتہاد زمانہ رسولؐ خدا میں جائز ہے)۔

یہ حوالہ دینے کے بعد شہید مطہریؒ فرماتے ہیں کہ:

''اس کے بعد یہ لفظ رائے اور قیاس کے معنوں میں کم استعمال ہونے لگا بلکہ اس کے معنی "احکام شرعی کو حاصل کرنے کے لئے علمی مجاہدہ کے لیئے لیا جانے لگا۔ اس معنوی تغیر وانقلاب کے بعد اس لفظ نے فقہ شیعہ میں اپنی راہ پیدا کر لی کیونکہ شیعہ اجتہاد رائے کے مخالف تھے، علمی مجاہدہ کے نہیں اور ایسا کوئی تعصب بھی نہ تھا کہ اگر ایک لفظ کسی زمانے میں غلط مفہوم رکھتا ہو تو مفہوم بدل جانے کے بعد قابل استعمال نہیں ہوسکتا یقیناً علمائے شیعہ میں سب سے پہلے جنہوں نے اس لفظ کو دوسرے معنوں میں استعمال کیا ہے وہ علامہ حلیؒ متوفی ۷۲۶ھ ہیں۔ آپ نے اپنی کتاب ''تہذیب الاصول'' میں ایک باب ''باب الاجتہاد'' کے عنوان سے قائم کیا اور اجتہاد سے وہی معنیٰ ومفہوم مراد لئے ہیں جو آج کل لئے جاتے ہیں اور یہی وہ زمانہ تھا جب لفظ اجتہاد نے شیعت کو قبول کیا یا دوسرے الفاظ میں شیعت نے اجتہاد کو قبول کیا۔''

''(شہید مطہریؒ کا بیان ختم ہوا)۔''

شہید مطہریؒ کی گفتگو ودلائل سے واضح ہوا کہ وہ افراد جو لفظ اجتہاد وتقلید کو لفظی بنیاد بنا کر اس کی ولادت چھٹی یا ساتویں صدی ہجری میں بتا کر لوگوں کو شبہات میں گرفتار کرتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟ اصولاً ہمیں الفاظ کی بحث نہیں کرنی چاہیئے کہ فلاں لفظ کب رائج ہوا کب نہیں بلکہ یہ دیکھا جائے کہ اجتہادی عمل کب سے جاری

ہے اور وہ اوپر کے دلائل سے ثابت ہو چکا کہ زمانہ رسولؐ و آئمہؑ ہی سے جاری وساری ہے۔

اعتراض (۶)

کچھ افراد کا یہ بھی کہنا ہے کہ مجتہد اعلم تو ایک ہی ہو سکتا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ ۳،۴ مجتہدین الگ الگ اپنا رسالہ عملیہ چھپوا کر اپنی تقلید کرواتے ہیں اور یہ بھی کہ اعلم کی تقلید غیر ممکن بھی ہے۔

جواب

کوئی بھی چیز جو ناپی جا سکتی ہو، تولی جا سکتی ہو یا گنی جا سکتی ہو اس میں عقلائے زمانہ میں اختلاف نہیں ہو سکتا یہ نہیں ہو سکتا کہ عقلاء کا اس بات میں اختلاف ہو کہ فلاں چیز ۲ کلو ہے یا ۳ کلو ہے یا فلاں کپڑے کی لمبائی ۲ میٹر یا ۳ میٹر ہے کیونکہ یہ سب ایسی چیزیں ہیں کہ جنہیں تول کر، ناپ کر یا گن کر معلوم کیا جا سکتا ہے اور عقلاء کا ان باتوں میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔ البتہ علم کیونکہ ایسی چیز نہیں ہے کہ جسے گن کر یا ناپ کر یا تول کر معلوم کیا جا سکے۔ لہٰذا کسی شخص کی علمیت یا اعلمیت جاننے میں عقلائے زمانہ میں اختلاف ہو جاتا ہے اور علم کا جانچنا ایک ایسی چیز ہے جس میں ہمیشہ سے عقلائے زمانہ مختلف فیہ ہیں اور جس میں اختلاف کا ہونا بھی عین قرین عقل ہے۔ لہٰذا اب ہر شخص کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خود تحقیق کرے کہ موجودہ مجتہدین میں علم کے اعتبار سے بڑا کون ہے؟ اور شہادت عدلین (۲ عادلوں کی گواہی) یا اختبار (خود پہچاننے کی صلاحیت) جیسے شرعی اصول انسان کی رہنمائی کرتے ہیں تاکہ وہ اس پریشانی سے نکل سکے اور کسی ایک معین مجتہد کی تقلید کرے اور ایسا زمانہ آئمہؑ میں بھی ہوتا رہا ہے جیسا کہ آقائے سید عبداللہ شبر نے مولائے کائناتؑ کے ۲ شاگردوں میں اختلاف کی صورت

میں مولاؑ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ خذ افقا ھمھما یا ایک نسخے میں واعلمھا (ان دونوں میں جو زیادہ علم رکھتا ہو یا جو زیادہ فقیہہ ہو اس کی بات کو مان لو)۔

اس صورت میں امام علیؑ نے مستقبل کے لئے بھی یہ اصول دیا کہ جس کا علم سب سے زیادہ ہو اس کی بات ماننا چاہیے جبھی علماء نے اختلاف فتویٰ کے علم کی صورت میں مجتہد کے اعلم ہونے کی شرط لگائی ہے۔

امامؑ نے اصولی جواب دیا تا کہ ان کے بعد کے مجتہدین اسی اصول سے فروعات کا استنباط کریں۔ جیسا کہ ایک اور موقع پر امام علیؑ نے فرمایا:

"علینا القاء الاصول وعلیکم التفریع" (بحوالہ جوامع حدیث)

(ہمارا کام اصول بتانا ہے اور تمہارا کام ان اصولوں سے فروعات کا استخراج و استنباط ہے)۔

علامہ ابن ادریس حلیؒ جیسے مجتہد اگر چہ خبر واحد کو قبول نہیں کرتے اور اس پر عمل بھی نہیں کرتے مگر اس حدیث کو اپنی کتاب "سرائر" میں ایک تسلیم شدہ اصل کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔

نہج البلاغہ میں بھی مولائے کائناتؑ نے ربانی و روحانی علماء کی خصوصیات ان الفاظ میں بیان کی ہیں کہ:

"قد نصب لنفسه الله فی ارفع الامور من اصدار کل وارد علیه او تصیر کل فرع الیٰ اصله"

(یعنی ربانی و روحانی عالم (مجتہد) خلوص نیت اور فیضان حکمت سے خود کو بلند ترین چوٹی پر پہنچا دیتا ہے اور جو مشکل اور دشوار مسئلہ اس کے سامنے آتا ہے تو اس کا حل وہ تلاش کر لیتا ہے)۔

ان روایات واحادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ احکام فقہ میں اجتہاد کرنا واستنباط کرنا فقہی سرمایہ ہے اور اصولوں سے فروعات کے استخراج کا میدان اتنا وسیع ہے کہ کسی مجتہد کو ہرگز قیاس اور من گھڑت قوانین پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اعتراض (۷)

کچھ لوگ یہ غلط فہمی بھی پھیلاتے ہیں کہ علماء تو فقط فقہ واصول فقہ ہی جانتے ہیں سائنس کی اتنی ترقیوں سے قطع نظر وہ بس مسجد و مدرسہ کے کمرے میں بیٹھے ہوئے فقط نجاست وطہارت یا نماز و روزہ ہی کے مسائل کا استنباط کرتے ہیں۔

جواب

شائد معترضین فقہ کے معنی ہی نہیں سمجھ پائے کہ عام زندگی میں جتنے مسائل پیش آتے ہیں ان سب میں فقہاء کی استنباط احکام تک تحقیق ہوتی ہے اور پھر وہ فتویٰ دیتے ہیں۔ البتہ کیونکہ تحقیق کا تعلق موضوعاتِ داخلی سے ہے موضوعاتِ خارجی سے نہیں اس لئے مثلاً وہ یہ تحقیق نہیں کریں گے کہ کون کون سی شراب ہے اور کون سی نہیں۔ وہ اصول بتادیں گے کہ **(الخمر حرام لانہ مسکرون)** شراب حرام ہے کیونکہ اس میں نشہ ہوتا ہے۔ اب جس جس شے میں نشہ پایا جائے خود تحقیق کرو۔ لوگوں نے دوسرے سیاروں پر جانے کے مسائل پوچھے، جدید بینکاری کے مسائل پوچھے، جدید اقتصادیت سے لے کر ٹیسٹ ٹیوب بے بی تک کے مسائل دریافت کیئے۔ فقہاء نے لاکھوں مسائل کا حل قرآن وسنت سے استنباط کرکے بتلایا۔ لیکن فقہاء کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ سائنس اور اس کی Applications سے متعلق تحقیق بھی شروع کردیں۔ وہ فقہاء ہیں سائنسدان نہیں ہیں اور سائنس اور اس کی Applications سے متعلق تحقیق کرنا ان کا موضوع ہی نہیں ہے۔

وہ سائنسدان جو فزکس کو Deal کرتا ہے کیا اس سے یہ بات کہنا معقول ہے کہ تم Biology میں تحقیق کیوں نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ اس کا موضوع ہی نہیں ہے۔ مجتہد کا کام فقط یہ ہے کہ عام شخص کو زندگی میں جتنے مسائل پیش آتے ہیں ان کا حل وہ قرآن وسنت سے تلاش کرے نہ کہ وہ خارج از موضوع مباحث میں گرفتار ہو جائے۔

اعتراض (۸)

بہت سے لوگوں کا یہ بھی اعتراض ہے کہ جب ہم خود قرآن وحدیث پڑھ سکتے ہیں اور احادیث کی کتابوں سے اور قرآن سے اپنے مسائل کا حل دریافت کر سکتے ہیں تو پھر ہمیں مجتہدین کی کیا ضرورت ہے؟

جواب

اگر کسی کی علوم قرآن اور علوم حدیث میں اتنی ہی نظر ہو تو پھر وہ شخص خود مجتہد ہے اور اسے واقعی کسی کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اگر کوئی قرآن میں ناسخ ومنسوخ، محکم و متشابہ، مطلق ومشروط آیات، لغاتِ عرب کا عالم ہو اور حدیث کے مندرجہ ذیل علوم کا ماہر ہو تو پھر واقعاً اس پر سے تقلید ہی ساقط ہو جائے گی اور وہ علومِ احادیث درج ذیل ہیں جن کو مجتہد بننے کے لئے حاصل کرنا ضروری ہے۔

(۱) محدث کی صداقت کا علم

(۲) اسناد حدیث کا علم

(۳) حدیث عالی کا علم

(۴) حدیث نازل کا علم

(۵) روایات موقوفہ کا علم

(۶) ان اسناد کا علم جس کی سند پیغمبر اسلام سے ذکر نہ ہو

(۷) صحابہؓ کے مراتب کا علم

(۸) احادیث مرسلہ اوران کے سلسلے میں پیش کی جانے والی دلیلوں کی معرفت

(۹) تابعین سے نقل کی گئی احادیث کا علم

(۱۰) اسناد مسلسل کا علم

(۱۱) احادیث معنعنہ کا علم

(۱۲) روایات معضل کا علم

(۱۳) احادیث مدرج کی پہچان کا علم

(۱۴) تابعین کی شناخت کا علم

(۱۵) اتباع تابعین کی معرفت

(۱۶) اکابرو اصاغر کی معرفت

(۱۷) اولاد اصحاب کی معرفت

(۱۸) علم جرح وتعدیل کی معرفت

(۱۹) صحیح وسقیم کی پہچان

(۲۰) فقہ الحدیث کا علم

(۲۱) ناسخ ومنسوخ احادیث کا علم

(۲۲) متن میں جو غریب (نامانوس) الفاظ استعمال ہوں ان کا علم

(۲۳) احادیث مشہور کا علم

(۲۴) غریب اور نامانوس احادیث کا علم

(۲۵) احادیث مفرد کی پہچان

(۲۶) ان لوگوں کی معرفت جو حدیث میں تدلیس کر دیتے ہیں

(۲۷) حدیث کی علتوں کی پہچان

(۲۸) شاذ روایات کا علم

(۲۹) پیغمبرؐ کی ان حدیثوں کا جانچنا جو دوسری احادیث سے معارض ہوں

(۳۰) ان حدیثوں کی معرفت جن کا کوئی رُخ کسی رُخ سے معارض نہ ہو

(۳۱) احادیث میں الفاظِ زائد کی معرفت

(۳۲) محدثین کے مذہب کی اطلاع

(۳۳) متون کی تحریری غلطیوں سے آگاہی

(۳۴) مذاکرۂ حدیث کا جانچنا اور مذاکرہ کرتے ہوئے راستگو کی معرفت

(۳۵) اسناد میں محدثین کی تحریری غلطیوں کی اطلاع

(۳۶) صحابہ، تابعین اور ان کے بھائیوں، بہنوں کی عصرِ حاضر تک معرفت

(۳۷) اُن صحابہ، تابعین، تباع تابعین کی معرفت جن میں سے بس ایک راوی نے روایت کی ہو۔

(۳۸) اصحاب تابعین اور ان کے پیروؤں میں سے جو راوی ہیں، عصرِ حاضر تک ان کے قبائل کی معرفت

(۳۹) صحابہ سے عصر حاضر تک کے محدثین کے انساب کا علم

(۴۰) محدثین کے ناموں کا علم

(۴۱) صحابہ، تابعین، تباع تابعین اور عصر حاضر تک ان کے پیروؤں کی نیت کا جاننا۔

(۴۲) راویانِ حدیث کے وطن کی پہچان

(۴۳) صحابہ، تابعین، تباع تابعین کی اولاد اور ان کے غلاموں کی معرفت

(۴۴) محدثین کی عمر کی اطلاع۔ ولادت سے وفات تک

(۴۵) محدثین کے القاب کی معرفت

(۴۶) ان راویوں کی معرفت جوایک دوسرے سے قریب ہیں۔

(۴۷) راویوں کے قبائل، وطن، نام، کنیت اوران کے پیشوں میں متشابہات کی پہچان

(۴۸) غزواتِ پیغمبرؐ، ان کے ان خطوط وغیرہ کا علم جوانہوں نے بادشاہوں کو تحریر فرمائے۔

(۴۹) اصحابِ حدیث نے جن ابواب کو جمع کیا ہے ان کی معرفت اوراس بات کی جستجو کہ ان میں سے کون ساحصہ ضائع ہوگیا ہے۔

(۵۰) اس کے علاوہ احادیث کی مندرجہ ذیل اقسام کا علم بھی ہونا چاہیے۔

(۱) صحیح	(۲) حسن	(۳) ضعیف
(۴) مسند	(۵) متصل	(۶) مرفوع
(۷) موقوف	(۸) مقطوع	(۹) مرسل
(۱۰) معضل	(۱۱) تدلیس	(۱۲) شاذ
(۱۳) غریب	(۱۴) معنعن	(۱۵) معلق
(۱۶) مفرد	(۱۷) مدرج	(۱۸) مشہور
(۱۹) مصحف	(۲۰) عالی	(۲۱) نازل
(۲۲) مسلسل	(۲۳) معروف	(۲۴) منکر
(۲۵) مزید	(۲۶) ناسخ	(۲۷) منسوخ
(۲۸) مقبول	(۲۹) مشکل	(۳۰) مشترک
(۳۱) موتلف	(۳۲) مختلف	(۳۳) مطروح
(۳۴) متروک	(۳۵) مول	(۳۶) مبین

(۳۷) مجمل	(۳۸) معلل	(۳۹) مضطرب
(۴۰) مہمل	(۴۱) مجہول	(۴۲) موضوع
(۴۳) مقلوب	(۴۴) حدیث ماثور	(۴۵) قدسی
(۴۶) عزیز	(۴۷) زائد الثقہ	(۴۸) موثق
(۴۹) متواتر		

اب اگر کوئی شخص تقلید نہ کرنا چاہے تو ٹھیک ہے وہ ان تمام علوم کو حاصل کرے اور احادیث وقرآن سے اپنے مسائل کا حل نکالے اور جو ایسا نہ کر سکے یا اس کے پاس اتنا وقت نہ ہو تو اس کے پاس سوائے تقلید کرنے کے اور کون سا راستہ رہ جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ تقلید ایسے شخص کے لئے جائز نہیں ہے جو اجتہاد پر قدرت رکھتا ہے، بلکہ صرف اس شخص کے لئے جائز ہے جو اجتہاد سے قاصر ہو جیسے عوام، جہلاء یا وہ طالب علم جس میں ہنوز صلاحیتِ اجتہاد پیدا نہ ہوئی ہو۔ ایسے لوگوں کے متعلق قواعد عامہ میں کہا گیا ہے کہ:

"الفتویٰ فی حق الجاهل کالاجتهاد فی حق المجتهد".

(فتویٰ ان پڑھ کے لئے ایسا ہی ہے جیسے اجتہاد مجتہد کے لئے)

(الجامع صفحہ ۳۲۶) یا

(فتاوی المجتهدین بالنسبة الی العوام کالادلة الشرعیه بالنسبة الی المجتهدین).

(عوام کے لئے مجتہدین کے فتووں کی وہی حیثیت ہے جو شرعی دلائل کی مجتہدین کے نزدیک) (الموافقات جلد نمبر ۴ صفحہ ۲۹۲)

اور عوام کے لئے تقلید کا جائز ہونا ایک معقول بات ہے کیونکہ اجتماعی اور

اقتصادی زندگی کا تقاضا یہ ہے کہ بعض لوگ صنعت وحرفت کے مختلف پیشوں میں مشغول ہوں۔ پس اجتہاد کے مواقع اسی شخص کو حاصل ہیں جو علمِ فقہ اور اصولِ فقہ میں مہارتِ تامہ رکھتا ہو۔ لیکن جس کو یہ مواقع حاصل نہ ہوں یا وہ مہارتِ تامہ نہ رکھتا ہو تو اس پر مجتہدین کی تقلید عقلاً وشرعاً واجب ہے اس آیت پر عمل کرتے ہوئے کہ:

(فاسئلو اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون).

"اگر تم علم نہیں رکھتے تو اہل علم سے پوچھو"۔

اعتراض (۹)

بہت سے افراد یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ امامؑ نے غیبت کبریٰ میں جاتے ہوئے تقلید کے لئے اپنے خصوصی نائبین کیوں نہ بنائے تاکہ ان کے وسیلے سے شیعہ ان سے رابطہ کر کے اپنی مشکلات حل کرواتے۔ امامؑ کا خصوصی نائب تقلید کے لئے مقرر نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ تقلید کا حکم اسلامی نہیں ہے بعد کی پیداوار ہے۔

جواب

تاریخ وروایات سے پتا چلتا ہے کہ امامؑ کے لئے اتنی مشکل تھی اور جان کا اتنا خوف تھا کہ امامؑ معصوم اپنے چوتھے نائب کے بعد غیبت کبریٰ میں چلے گئے۔ روایت میں ہے کہ امام حسن عسکریؑ نے حضرت حجتؑ کو بچانے کی غرض سے اپنی وصیت تک میں صاحب الامرؑ کو اپنا وصی نامزد نہ کیا۔ بلکہ آپؑ کی والدۂ ماجدہ کو وصی بنایا تاکہ وہ ان کے کام انجام دیں۔ (اصول کافی باب مولد ابی محمد الحسن ابن علیؑ)

امام حسن عسکریؑ نے بیٹے کی بات کو جان بوجھ کر وصیت میں پوشیدہ رکھا تاکہ ان خطرات سے صاحب الامرؑ محفوظ رہیں جو بادشاہ وقت کی طرف سے ان کو لاحق تھے۔ امام حسن عسکریؑ اس سلسلے میں اس قدر محتاط تھے اور بیٹے کی ولادت کی خبر کے

انکشاف سے بھی اتنے ہوشیار تھے کہ کبھی کبھی اس قدر مجبور ہوتے تھے کہ اپنے خاص اصحاب سے بھی تقیہ برت کر اس امر کو چھپا لیتے تھے اور ان پر صورت حال کو مشتبہ بنا دیتے تھے۔ (بحار الانوار جلد نمبر ۵۱، صفحہ نمبر ۲۲، اثبات الھداۃ جلد نمبر ۷، صفحہ ۸۷، اثبات الوصیہ صفحہ ۱۹۸)

تو جب امام معصومؑ کے لئے اس قدر دشمنی پائی جاتی تھی اور حضرت حجتؑ کے چوتھے نائب کے انتقال کے بعد حالات اتنے خراب ہو گئے تھے کہ اگر امامؑ ان کے بعد کسی اور کا نام بتا کر جاتے تو دشمن ان نائبین کو بھی آزاد نہ چھوڑتے اور قتل کر دیتے۔

اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ غیبت صغریٰ کے بعد غیبت کبریٰ کا آغاز ہونا تھا اور آہستہ آہستہ لوگوں کو اس بات کا عادی بنانا تھا۔ کیونکہ عوام الناس کے لئے امام اور رہبر کا نظروں سے اوجھل ہونا اور وہ بھی طویل مدت کے لئے یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو نہایت عجیب و غریب اور نامانوس ہے اور اس پر لوگوں کا یقین کرنا مشکل ہے۔ اسی وجہ سے پیغمبرؐ اور آئمہؑ نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ اس بات سے لوگوں کو رفتہ رفتہ آشنا کریں اور اس کو قبول کرنے کے لئے ان کے افکار کو آمادہ کریں۔ لہٰذا وہ وقتاً فوقتاً غیبت کی خبر دے کر زمانہ غیبت کے دوران لوگوں کو تکلیفوں، غیبت سے انکار اور منکرین کی سزا، ثبات قدم کا ثواب اور زمانہ ظہور کے انتظار کی باتیں لوگوں کو سناتے تھے کبھی اپنی رفتار و گفتار سے عملی طور پر غیبت کی شبیہ فراہم کرتے تھے۔

مسعودی نے اثبات الوصیہ میں تحریر کیا ہے کہ جب امام حسن عسکریؑ امام ہادیؑ کی جگہ تشریف فرما ہوئے تو وہ اکثر پردے کے پیچھے سے لوگوں سے کلام کرتے تھے تاکہ شیعہ بارہویں امامؑ کی غیبت کو قبول کرنے پر تیار ہو جائیں۔ (اثبات الوصیہ صفحہ ۲۰۶)

اگر امام حسن عسکریؑ کی وفات کے فوراً بعد غیبت کبریٰ شروع ہو جاتی تو ممکن تھا کہ امام زمانہ کا وجود ہی فراموش کر دیا جاتا۔ اسی وجہ سے شروع ہی میں غیبت صغریٰ کی ابتداء ہوئی تا کہ شیعہ ان دنوں میں نائبینِ امامؑ کے وسیلے سے اپنے امامؑ سے تعلق پیدا کر کے علامتوں اور کرامتوں کا مشاہدہ کر لیں اور ان کا ایمان کامل ہو جائے۔ لیکن جب افکار ساتھ دینے لگے اور رجحانِ غیبت زیادہ ہو گیا تو غیبت کبریٰ شروع ہو گئی۔

حسین ابن احمد کہتے ہیں کہ امامؑ کے چوتھے نائب علیؒ بن محمد سمری کی وفات سے چند روز قبل میں ان کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک خط جو بارگاہِ امامؑ سے جاری ہوا تھا انہوں نے لوگوں کے سامنے پڑھا جس کا مضمون یہ تھا:

''اے علیؒ بن محمد سمری! خدا تیری موت کے سلسلے میں تیرے بھائیوں کے اجر میں اضافہ کرے اس لئے کہ تو چھ دن کے اندر اندر دنیا کو خیر آباد کہہ دے گا، اپنا کام مکمل کر لیکن کسی کو اپنا جانشین نہ بنانا، اس لئے کہ اس کے بعد کامل غیبت شروع ہو گی''۔

(بحار الانوار جلد نمبر ۱۵، صفحہ ۳۶۱)

اس میں امامؑ نے علیؒ ابن محمد سمری کو منع بھی کر دیا کہ کوئی خاص نائب نہ بنانا کیونکہ نائب خود سے مقرر کرنے کا کام سمری کا تھا بھی نہیں اور غیبت کو بہت ہی طولانی بھی ہونا تھا۔ جس میں کسی یا چند ایک خاص نائبین کی ضرورت نہ تھی ورنہ بہت سے امامؑ کے نائب ہونے کا دعویٰ کرنے والے پیدا ہو جاتے اور لوگوں کو اپنے غلط افکار سے گمراہ کرتے۔

روایت ہے کہ ''جب علیؒ بن محمد سمری کی وفات نزدیک ہوئی تو شیعوں کی ایک جماعت ان کی خدمت میں پہنچی تا کہ ان کے جانشین کے بارے میں ان سے پوچھا جائے۔ وہ فرمانے لگے کہ مجھے کسی کو جانشین بنانے کا حکم نہیں ہے۔ (بحار الانوار جلد

نمبر ۱۵، صفحہ ۳۶۰)

تو لہٰذا اپنے خاص نائبین نہ بنانے کی ایک وجہ تو امت کو جھوٹے نائبین سے محفوظ رکھنا تھا۔ دوسرا یہ کہ اگر انہیں بتا بھی دیتے تو خطرہ تھا کہ انہیں قتل کر دیا جاتا اور اگر نائبین بنانے ہی ہوتے تو پھر ضروری تھا کہ غیبت کبریٰ کے فوراً بعد سے لے کر ظہور امامؑ تک کے تمام نائبین کے نام بتا کر جاتے۔ جو کہ ایک غیر معقول بات ہوتی۔ لہٰذا امامؑ کے لئے ضروری تھا کہ وہ اصول بتا کر جاتے اور امامؑ بتا کر بھی گئے کہ:

"فاما الحوادث الواقعه فارجعو فیها الیٰ رواة احادیثنا فانهم حجتی علیکم وانا حجة الله".

آئندہ پیش آنے والے مسائل میں تم ہمارے راویانِ حدیث کی طرف رجوع کرو (یعنی فقہاء و مجتہدین کی طرف) کیونکہ یہ میری طرف سے تم پر حجت ہیں جس طرح ہم ان پر خدا کی طرف سے حجت ہیں۔

یہ بات بھی کہے بغیر نہ رہ جائیں کہ غیبت امامؑ سے متعلق جتنی باتیں ہیں، ضروری نہیں ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی حکمت بھی ہمیں پتا ہو۔ ان میں بہت سی باتیں خدائی راز ہیں۔ جیسا کہ مختلف روایات سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

"عبداللہ بن فضل ہاشمی کہتا ہے کہ امام صادقؑ نے فرمایا کہ: فضل! غیبت کا موضوع خدا کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ جب ہم خدا کو صاحبِ حکمت جانتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ ہم اعتراف کریں کہ اس کے کاموں میں کوئی نہ کوئی حکمت کارفرما ہوتی ہے چاہے اس کی تفصیل ہمیں معلوم نہ ہو۔ (بحار الانوار۔ جلد نمبر ۵۲، صفحہ ۹۱)

لہٰذا ہماری جو ذمہ داری دیگر آئمہؑ اور خود بارہویں امامؑ نے بتائی ہے ہمیں اسی کو اپنانا چاہیئے۔ جب امام قائمؑ نے فرما دیا کہ ہمارے راویانِ حدیث یعنی مجتہدین کی

طرف رجوع کرو۔ کیونکہ وہ تم پر ہماری طرف سے حجت ہیں تو لہٰذا ہماری ذمہ داری امامؑ کی حجت کی پیروی کرنے پر پوری ہو جاتی ہے۔

اعتراض (۱۰)

بہت سے لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ تقلید میں ساری ذمہ داری مجتہد کی ہوتی ہے ہماری ذمہ داری نہیں جبکہ آیات و روایات سے تو یہ پتا چلتا ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔

جواب

جب آیات و روایات سے ثابت ہو چکا کہ خود امامؑ نے تقلید کا حکم دیا ہے کہ مجتہدین کی پیروی کرو تو اب ان مجتہدین کی پیروی دراصل امامؑ ہی کی پیروی ہے اور یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ مجتہد جو کچھ کہتا ہے وہ قرآن و حدیث ہی سے کہتا ہے۔ تو اب مقلِد کا عمل مجتہد کے فتویٰ کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں قرآن و حدیث کے مطابق ہوتا ہے۔ یعنی کہ مقلِد کے عمل کی ذمہ داری مجتہد پر بلاواسطہ اور قرآن و حدیث پر بالواسطہ مجتہد ہوتی ہے۔۔۔ ہاں اگر مجتہد قرآن و سنت سے فتویٰ کو اخذ نہ کرتا اور اپنے ذاتی تعقّل کو دین میں جاری کر دیتا تو پھر اس پر یہ ذمہ داری ڈالنا عقلاً و شرعاً صحیح نہ ہوتا بلکہ مجتہد اپنی پوری صلاحیتوں کو استعمال کر کے یہ فتویٰ قرآن و حدیث سے اخذ کرتا ہے اس میں اگر وہ غلطی پر بھی ہو۔ (کیونکہ بہرحال وہ غیرِ معصوم ہے) تب بھی روایات سے پتا چلتا ہے کہ اس میں بھی اس کے لئے اجر ہے۔ جیسا کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔

"اذا حکم الحاکم فاجتهد، ثم اصاب فله اجران واذا حکم اجتهد ثم اخطافله اجر".

(یعنی جب کوئی مجتہد حکم دینے میں صحیح اجتہاد کرے تو اس کے لئے دو اجر ہیں اور اگر اس نے اجتہاد میں غلطی کی تو اس کے لئے ایک اجر ہے)۔

اعتراض (۱۱)

ایک اعلم کی تقلید کی کیا ضرورت ہے؟ یہ دور تو Specialization کا دور ہے اس میں فقہ کے ہر شعبہ میں الگ الگ ماہر مجتہدین ہونے چاہئیں اور کسی ایک ''اعلم'' کی تقلید کی ضرورت نہیں ہے۔

جواب

ہماری فقہ کے اعتبار سے مجتہدین کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) مجتہدِ مطلق (۲) مجتہدِ متجزی

مجتہد مطلق وہ ہوتا ہے جو پوری فقہ کے ہر شعبہ کا مکمل ماہر ہو اور اگر کسی ایک شعبہ کا بھی وہ مکمل ماہر نہ ہو تو وہ مجتہد مطلق نہیں ہو سکتا۔

مجتہد متجزی وہ ہوتا ہے جو کسی ایک یا چند ایک فقہی ابواب میں مہارت رکھتا ہو، مکمل فقہ میں نہیں۔

اور یہ فقہی مسئلہ بھی ہے کہ اگر مجتہد اعلم سے بھی او پر نکل جائیں تو اس شعبہ میں اس مجتہد متجزی کی تقلید ہوگی اور بقیہ شعبوں میں اسی اعلم کی تقلید ہوگی۔ اور اگر فقہ کے کئی ابواب کے ایسے ماہرین مجتہدین متجزی سامنے آجائیں جن کی اپنے شعبوں میں مہارت ''اعلم'' سے بڑھ جائے تو شعبہ کے اعلم متجزی مجتہد کی اس کے اپنے شعبہ میں تقلید ہوگی۔

لیکن ایسا عملاً ہوتا نہیں ہے۔ مجتہد مطلق کی مہارت عملی طور پر تمام فقہی ابواب میں سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کی تقلید ہر شعبہ میں کی جاتی ہے اور جہاں اس

سے مسئلہ حل نہ ہو سکے تو وہ احتیاط واجب یا اشکال جیسے الفاظ اپنے رسالہ عملیہ میں استعمال کرتا ہے تا کہ اس کا مقلِد اگر چاہے تو اس کے بعد سب سے بڑے ماہر مجتہد کی طرف اس مسئلے میں رجوع کر سکتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ اجتہاد و تقلید ایک شرعی حکم ہے۔ جس پر اعتراض خدا اور رسولؐ و امامؑ پر اعتراض ہے اور جو لوگ تقلید کے حرام ہونے کا فتویٰ دیتے ہیں اور لوگوں کو تقلید نہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں آیا وہ خود فتویٰ نہیں دے رہے؟ کیا لوگوں کے لئے ان کی باتوں کی پیروی اور تقلید کرنا غلط نہیں ہے اگر غلط ہے تو وہ لوگوں کو یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہماری گفتار کی پیروی اور تقلید کرنا بھی حرام ہے، ہماری بات نہ ماننا۔

اعتراض (۱۲)

جب خدا، اس کے رسولؐ اور آئمہؑ کی باتوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ مجتہدین خدا، رسولؐ و اہل بیتؑ ہی کے احکامات بتلاتے ہیں تو پھر ان کے فتوؤں میں اتنا اختلاف کیوں ہوتا ہے؟

جواب

بہت عرصے سے یہ اشکال دلوں سے نکل کر زبانوں پر آ رہا ہے اور پھر یہ اعتراض کرنے والے بھی دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ایک گروہ تو مجتہدین کے ساتھ بد ظنی کے الجھاؤ میں اس قدر پھنس گیا کہ خوش اعتقادی کے باوجود شکوک کے اس بھنور سے نکل نہیں پا رہا ہے اور دوسرا گروہ اس مسئلے کو صحیح طور پر سمجھے بغیر تقلید ہی کو چھوڑ بیٹھا ہے۔

جاننا چاہئے کہ ہر شعبہ کی نظری اور فکری مسائل میں اس کے ماہرین کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ تمام سائنسدانوں، ڈاکٹروں

اور ماہرین اس شعبے کے تمام مسائل میں ایک رائے رکھتے ہوں۔ پھر آخر اسلامی علوم ہی کے ماہرین پر یہ اعتراض کیوں کیا جائے کہ ان کی ایک رائے کیوں نہیں ہے۔

جب بھی طبی کمیشن تشکیل دیئے جاتے ہیں تو ان کے اراکین کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بحث اور مشاورت کے باوجود وہ اختلاف رائے کو دور کرنے اور اس کا کوئی ایک حل تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔

اور اس کے اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ ہر شخص ایک خاص انداز فکر اور ذوق کا مالک ہوتا ہے۔ اور جس وقت وہ مطالعہ کرتے ہوئے مختلف شواہد، قرائن و مقدمات کو پیش نظر رکھتا ہے اور ان میں بعض کو ترجیح دیتا ہے اور بعض کو رد کر دیتا ہے اور اصل بات بھی یہی ہے کہ جب بعض مسائل متعدد احتمالات کے حامل ہوتے ہیں تو صاحب نظر افراد کے درمیان ان کی تشریح و توجیہہ میں بہت کم اتفاق رائے ہوتا ہے۔

اور اسی وجہ سے فقہاء و مجتہدین کے درمیان جو اختلاف رائے ہوتا ہے اس کی بنیاد علمی و تحقیقی ہے۔ نفسانی خواہشات اور شخصی اغراض کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا اور اگر خدانخواستہ کوئی مجتہد فتویٰ کے اس مقدس مقام پر نفسانی خواہشات یا ذاتی مفادات کا شکار ہو جائے تو پھر اسلامی حکم کی وجہ سے مجتہد اپنی شرائط پر پورا نہیں اترتا اور لوگ اس کی تقلید نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اس طرح کا اختلاف رائے علم و فن کے تمام شعبوں میں پایا جاتا ہے۔ صرف فقہ اسلامی کے شعبے کے ساتھ ہی یہ اختلاف مخصوص نہیں ہے اور پھر اس اختلاف کا پیدا ہونا بالکل قدرتی اور فطری ہے۔ جیسا کہ ہماری ذیل کی وجوہات سے بھی ظاہر ہو جائے گا۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ مجتہدین کے درمیان فقہی اختلافات زیادہ تر روایات معصومینؑ میں اختلافات کی وجہ سے ہیں اور ان اختلافی روایات کی چند ایک

وجوہات کا ہم تذکرہ کریں گے۔

پہلی وجہ

رسولؐ خدا پر جب بھی کوئی حکم پروردگار عالم کی طرف سے نازل ہوتا تھا۔ جناب رسالت مآبؐ قولاً وعملاً خود کر کے بتلا دیتے تھے۔ وضو کا حکم آیا تو خود کر کے بتلا دیا، نماز کے احکامات آئے، پڑھ کر بتلا دی، وہ زمانہ سادہ تھا اور لوگوں کے اذہان بھی بہت سادہ ہوتے تھے تو اکثر صحابہ احتمالات اور عقلیات دریافت بھی نہیں فرماتے تھے اور جو مسئلہ بحیثیت واقعہ پیش آتا تھا وہ رسولؐ خدا سے دریافت کر لیا جاتا تھا اور جناب رسولؐ خدا اس مسئلے کے موافق ومناسب حکم ارشاد فرما دیتے تھے مثلاً وہ واقعہ جب ایک نابینا صحابی نے آکر حضورؐ سے عرض کیا کہ مجھے مسجد تک پہنچانے کے لئے کوئی شخص نہیں ہے مجھے اس کی اجازت دیں کہ گھر ہی میں نماز پڑھ لوں اور مسجد میں حاضر نہ ہوا کروں، حضورؐ نے اجازت دے دی اور پھر یہ معلوم فرما کر کہ ان کا گھر اتنا قریب ہے کہ اذان کی آواز ان کے گھر میں جاتی ہے، ان کو اجازت نہ دی اور پھر مسجد میں آکر شرکت نماز کا حکم فرمایا۔ لیکن عتبان بن مالک کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے ان کا عدم بینائی کا عذر قبول فرما کر ان کو مسجد میں نہ آنے کی اجازت دے دی۔

یا وہ واقعہ جس میں امام معصومؑ نے دو الگ الگ صحابیوں کی حالت کے مطابق ایک کو یہ حکم بتایا کہ خرگوش کا گوشت کھایا جا سکتا ہے (کیونکہ امامؑ جانتے تھے کہ وہ اس علاقے کا رہنے والا ہے جہاں خرگوش کا گوشت نہ کھانا تشیع کی پہچان تھی اور نہ کھانے پر جرم تشیع میں اس شخص کی زندگی کو خطرہ تھا) اور دوسرے شخص کو یہ حکم بتایا کہ خرگوش کا گوشت نہیں کھایا جا سکتا (کیونکہ وہ عام مومنین ہی کے علاقے میں رہتا تھا) اس روایت کو شیخ مرتضیٰ انصاریؒ نے رسائل میں اس مقام پر جہاں ''تعارض الادلہ'' پر

بحث کی ہے پیش کیا ہے اس بناء پر مختلف احکامات کو ۲ اوقات میں سننے والے جہاں جہاں جائیں گے وہی امر نقل کریں گے جو انہوں نے اپنے کانوں سے معصومؑ سے سنا تھا کیونکہ رسولؐ اور امامؑ کے سامنے جو مجمع ہوتا تھا ان میں معذور، غیر معذور، قوی و ضعیف، ہر نوع کے اشخاص ہوتے تھے اور ہر شخص کے حالات اور قوت وضعف کے اعتبار سے حکم بدل جایا کرتا ہے۔

الحاصل۔ اختلاف روایت کی بڑی وجہ سوال پوچھنے والوں کے حالات کا مختلف ہونا بھی ہے کہ رسولؐ و امامؑ نے مختلف احوال و اوقات کے لحاظ سے دو وقتوں میں دو اشخاص کو علیحدہ علیحدہ حکم ارشاد فرمائے اور جس مجمع میں جو حکم بتایا گیا، دوسرا حکم بتاتے وقت وہی پرانا مجمع ہونا ضروری نہیں کہ موجود ہو اس لئے دو جماعتیں، دو مختلف احکامات کی ناقل بن گئیں۔ اب کچھ ایسے صحابہ بھی ہوتے ہوں گے جنہوں نے دونوں حکم سنے اور ان کو ضرور یہ تامل اور غور وفکر کی ضرورت پیش آئی کہ ان مختلف احکامات کی وجہ کیا ہوئی۔ اب ذخیرہ احادیث میں ان مختلف روایات کے آنے کے بعد فقہاء و مجتہدین کا فریضہ ہے کہ وہ دونوں طرح کی روایات کا ماخذ اور موقعہ محل تلاش کر کے اس کے موقع پر محمول فرمادیں لیکن اس کے باوجود بھی (جیسا کہ آگے چل کر واضح ہو جائے گا) فقہاء میں اختلاف رائے ہو جاتا ہے اور ایسا ہونا روایات کے مختلف ہونے کی وجہ سے بدیہی اور فطری ہے۔

اب ایک عام شخص کے سامنے اگر ان سب روایات کا لفظی ترجمہ ہو وہ بیچارہ سوائے حیرانی کے اور کیا کر سکتا ہے لامحالہ پریشان ہوگا اور مختلف قسم کے اشکالات پیش آئیں گے اس لئے بالآخر ان حضرات کو جو کسی کی تقلید نہیں کرتے، سوائے تقلید کے کوئی اور راہ باقی نہیں رہتی اور علماء کے تجربے سے بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ جو

لوگ اس بے علمی کی وجہ سے تقلید کو چھوڑ بیٹھتے ہیں یا تقلید ہی نہیں کرتے، مشاہدہ یہ ہے کہ بالآخر وہ اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں اور بالکل ہی لا مذہب بن جاتے ہیں اور کسی دین و مذہب یا شریعت کے پابند نہیں رہتے اور احکام شریعت سے فسق و خروج تو اس آزادی کا ادنیٰ نتیجہ ہے۔

دوسری وجہ

اکثر اوقات جو ہمیں اختلافِ روایات نظر آتا ہے وہ علتِ حکم کے اختلاف کی وجہ سے بھی پیش آتا ہے مثلاً روایت میں ہے کہ نبی اکرمؐ تشریف فرما تھے کہ ایک کافر کا جنازہ قریب سے گذرا، آپؐ کھڑے ہو گئے۔ علماء فرماتے ہیں کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ ان ملائکہ کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوئے تھے جو جنازے کے ساتھ تھے۔ اس صورت میں اگر مومن کا جنازہ گذرے تو بطریق اولیٰ کھڑا ہونا چاہئے لیکن دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ اس لئے کھڑے ہوئے تھے کہ کافر کا جنازہ مسلمانوں کے سر سے اونچا نہ ہو کہ اس میں توہین کا پہلو ہے۔ تو اس صورت میں کھڑا ہو جانا صرف کافر کے جنازے کے ساتھ مخصوص ہوا۔

غرض کہ روایات میں بعض اوقات حکم کو روایت کرنے والے نے کسی علت پر محمول سمجھا اور دوسرے روایت کرنے والے نے کسی دوسری علت پر محمول کیا اور دونوں اپنے اپنے فہم کے مطابق اس کو نقل کریں گے جس طرح ان کے ذہن میں ہے۔

لیکن جس شخص کے سامنے دونوں روایات ہیں، یقیناً وہ ایک علت کو ترجیح دے کر کسی ایک روایت کو اصل قرار دے گا۔ دوسری کے لئے کسی توجیہ کی فکر کرے گا مگر کون؟ صرف وہ شخص جس کے سامنے ہر مضمون کی سینکڑوں روایات موجود ہوں اور ہر

ہر حدیث کے مختلف الفاظ سامنے ہوں۔ بخلاف اس شخص کے جس کے سامنے ایک ہی حدیث کا ترجمہ ہو۔ نہ اس کو کسی دوسری حدیث کے ٹکراؤ (تعارض) کا علم ہو اور نہ وجوہ ترجیح کی خبر ہو۔ وہ کیا علتِ حکم (حکم کی وجہ) کے رجحان کو سمجھ سکتا ہے اور کیا کسی حدیث کو ترجیح دے سکتا ہے۔

تیسری وجہ

روایات واحادیث کے اختلاف کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ بہت سے الفاظ کلام معصومینؑ میں ایسے استعمال ہوتے ہیں جن کے لغوی معنی بھی مستعمل ہیں اصطلاحی معنی بھی۔ نبیؐ یا آئمہؑ نے ایک معنی کے لحاظ سے کلام ارشاد فرمایا جبکہ سننے والوں نے دوسرے معنی میں سمجھا۔ مثلاً ایک روایت کے مطابق جناب سلمان فارسیؓ نے حضورؐ سے عرض کیا کہ میں نے توریت میں پڑھا ہے کہ کھانے کے بعد وضو کرنا برکت طعام کا سبب ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ کھانے سے قبل اور کھانے کے بعد دونوں وقتوں میں وضو کرنا برکتِ طعام کا سبب ہے۔ اسی جگہ سلمانؓ کے کلام میں بھی اور جناب رسولؐ خدا کے ارشاد میں بھی وضو کا لفظ ہاتھ دھونے کے معنوں میں ہے۔ جبکہ بعض نے اس کو اصطلاحی معنوں میں لیا ہے۔

چوتھی وجہ

بعض اوقات مجتہدین میں الفاظ روایت کا مفہوم سمجھنے میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات بھی واضح ہے کہ جس طرح سے کبھی ایک شعر کے معنی متعین کرنے میں مختلف آراء اور نظریات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مثلاً شیخ سعدی کا یہ شعر:

از در بخشندگی و بندہ نوازی
مرغ ہوا را نصیب ماہی دریا

بعض کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں:

''کہ شاعر کی مراد یہ ہے کہ خدا نے ازراہ مہربانی بعض پرندوں کو بعض مچھلیوں کی غذا بنادیا ہے۔'' (ماہی سفرہ ایک خاص قسم کی مچھلی ہے جو پرندوں کو شکار کرنے کے لئے سطح آب پر تیرتی ہے)۔

بعض اس شعر کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ:

''خدا نے ازراہ مہربانی مچھلیوں کو ہوا میں اڑنے والے پرندوں کی غذا بنایا ہے''۔

بعض شعراء کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ:

''خدا نے ازراہ مہربانی فضا کو پرندوں کا حصہ بنایا تا کہ وہ اس میں پرواز کریں اور دریا کو مچھلیوں کا حصہ بنایا تا کہ وہ اس میں تیرتی رہیں''۔

لیکن ایک گروہ ان تینوں تشریحات کو قبول نہیں کرتا اور اس طرح شعر کی تشریح کرتا ہے:

''کہ خدا نے ازراہ مہربانی اور بندہ پروری پرندوں اور مچھلیوں یعنی حیوانات کے گوشت کو انسانوں کی غذا قرار دیا ہے''۔

یا مثلاً شاعر کا یہ شعر کہ:

دم بھر نہ ٹھہرے دل میں نہ آنکھوں میں ایک پل
اتنے سے قد پہ تم بھی قیامت شریر ہو

بعض کے نزدیک یہ شعر شاعر نے اپنے خیالی محبوب کے لئے کہا ہے اور بعض کے نزدیک اس سے مراد آنسو ہیں کہ جب دل بھر آتا ہے اور پھر آنسو آنکھوں میں آجاتے ہیں تو وہ آنکھوں میں بھی نہیں ٹھہرتے اور بہہ جاتے ہیں۔

بالکل اسی طرح روایاتِ معصومینؑ کے سمجھنے میں بھی اختلاف ہو جایا کرتا ہے۔ بعض فقہاء کے نزدیک روایت کے ایک معنیٰ لئے جاتے ہیں اور بعض دوسرے معنیٰ کو اختیار کرتے ہیں اور کسی ایک معنیٰ کو اختیار کرنے کے لئے وہ اپنے دلائل بھی رکھتے ہیں۔

مسئلہ نماز جمعہ

مثلاً نماز جمعہ کے وجوب میں علماء کے کئی گروہ ہو گئے اور یہ اختلاف بھی زیادہ تر مفہوم حدیث کو سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ معصومؑ کی حدیث ہے کہ:

لا جمعة بدون الامام.

(جمعہ نہیں ہو سکتا اگر امام نہ ہو)۔

اب یہاں لفظ امام نہ ہونے سے امامؑ کی کیا مراد ہے؟ بعض علماء نے کہا کہ یہاں امام سے مراد امام معصومؑ ہیں۔ غیبت امامؑ میں جمعہ نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے سید مرتضیٰؒ کا فتویٰ یہ تھا کہ غیبت امامؑ میں نماز جمعہ پڑھنی حرام ہے اور بعض علماء نے اس کا یہ مفہوم لیا کہ امام سے مراد امامِ جماعت ہے۔ یعنی امامؑ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ نماز جمعہ فرادیٰ نہیں ہو گی ہمیشہ جماعت سے پڑھی جائے گی۔ ان معنوں کو اختیار کرنے والے علماء کے نزدیک نماز جمعہ واجب رہے گی۔

مسئلہ خمس

مثلاً خمس کی ادائیگی میں فقہاء کا اختلاف بھی مفہوم حدیث کو سمجھنے ہی کا اختلاف ہے کہ جس میں امام معصومؑ نے فرمایا کہ:

''ہم نے اپنے شیعوں پر سے خمس کو معاف کر دیا ہے''۔

(جبکہ زیادہ تر روایات میں ہے کہ ہم ایک ایک درہم کا حساب اپنے شیعوں

سے لیں گے)۔

اب یہاں لفظ خمس معاف کر دیا ہے؟ سے امامؑ کی مراد کیا ہے۔ اس کے مفہوم میں اختلاف ہے۔ "شیخ مفید" کا نظریہ تھا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم نے اُس زحمتِ خمس کو معاف کر دیا ہے کہ ہمیں لاکر دو بلکہ زمین ہی میں دفن کر دو یعنی خمس معاف نہیں کیا ہے بلکہ خمس پہنچانے کی زحمت کو معاف کیا ہے۔ کیونکہ شیخ مفید" کا زمانہ وہ تھا کہ جس کسی کے متعلق یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ خمس نکالتا ہے اسے قتل کر دیا جاتا تھا کیونکہ خمس حکومت کا حق سمجھا جاتا تھا اور جو خمس خود لیتا ہو وہ گویا اس ملک میں دوسری Parallel حکومت بنا رہا ہے تو اسے قتل کر دیا جاتا تھا۔ تو اب یہاں خمس کو معاف کر دیا ہے سے مراد یہ ہے کہ تمہاری آسانی کے لئے کہ تمہاری جانیں بچ جائیں ہم نے تم پر لا کر دینے کی زحمت معاف کر دی ہے بلکہ زمین ہی میں اس کو دفن کر دو اور بعض کے نزدیک اس کے بھی دلائل ہیں کہ جب امامؑ ظہور کریں گے تو زمین اپنے سارے خزانے اگل دے گی تو وہ خمس بھی امام تک پہنچ جائے گا۔

بعض متقدمین کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ بالکل ہی معاف ہے۔ لیکن زیادہ تر فقہاء کا نظریہ ہے جو کہ اور دلائل کی روشنی میں ہے کہ مرادِ امامؑ یہ ہے کہ کافروں سے یا غیر معتقد (جو خمس کا اعتقاد نہیں رکھتے) سے جو مال ملتا ہے اس پر سے خمس معاف ہے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں امام معصومؑ نے ان لوگوں کے ساتھ لین دین کی اجازت دی ہے اگرچہ یہ لوگ خمس نہیں دیتے۔ یعنی اگر کسی کے مال پر خمس واجب ہو اور وہ نہ دے تو اس کا مال حرام ہے اور اگر حرام ہے تو اس سے خریدنا اور کاروبار کرنا سب حرام ہے۔ دوسرے الفاظ میں امامؑ نے ان سے کاروبار و معاملہ کرنے کی اجازت دی ہے ورنہ اگر ان سے خرید و فروخت یا کاروبار نہ کیا جائے تو ایک زحمت و مشکل میں مومنین

گرفتار ہو جائیں۔

مسئلہ وضو

یا وہ روایت جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص خدمت امامؑ میں آیا اور کہا مولاؑ میرے پاؤں پر پٹی بندھی ہے میں مسح کس طرح کروں۔ امامؑ نے فرمایا: ''تم پر معاف ہے''۔

اب یہاں معاف ہے سے کیا مراد ہے؟ اس کے مفہوم کو سمجھنے میں فقہاء میں اختلاف ہو گیا۔ بعض نے کہا کہ اگر پاؤں پر پٹی بندھی ہو تو پھر وضو ہی معاف ہے۔ یعنی تیمم سے نماز پڑھنا ہے اور بعض کے نزدیک معاف ہے سے مراد یہ ہے کہ پٹی اتار کر پاؤں پر مسح معاف ہے یعنی پٹی ہی کے اوپر مسح کر لو۔ یعنی دوسرے الفاظ میں یہ وضوٗ جبیرہ کا موقع ہے۔

یا وہ حدیثِ رسولؐ کہ:

حب علی یا کل الذنوب کما تاکل النار الحطب.

کہ علیؑ کی محبت گناہوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح آگ سوکھی لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

ظاہری الفاظ حدیث سے بعض نے اس کا یہی مطلب لیا کہ اگر علیؑ کا محب گناہ کر بھی لے تو علیؑ کی محبت اس کو ختم کر دے گی۔ لیکن بعض نے یہ مطلب لیا کہ اگر علیؑ کی محبت دل میں آ جائے تو پھر مومن گناہ کرے گا ہی نہیں۔ گناہ ہی ختم ہو جائیں گے۔ گناہ کا خیال بھی دل میں نہ آئے گا۔

یا مثلاً وہ حدیث کہ:

الجنتہ تحت اقدام الامہات

(جنت ماں کے قدموں تلے ہے)

بعض علماء نے اس سے یہ مراد لی ہے کہ اس میں خطاب اولاد سے ہے کہ تم ماں کی خدمت اور اس کے دل کو خوش کر کے جنت کو حاصل کر سکتے ہو اور بعض علماء کے نزدیک اس میں خطاب ماں کو ہے کہ اے ماں! یہ تجھ پر منحصر ہے کہ اچھی تربیت کر کے اپنی اولاد کو جنتی بنادے۔ یعنی تیری اولاد کی جنت تجھ پر، اور تیری تربیت پر منحصر ہے۔

ان تمام مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بعض اوقات مفہوم روایت سمجھنے میں اختلاف ہو جایا کرتا ہے اور جو عین قرین عقل بھی ہے۔

پانچویں وجہ

روایت کا باہمی ٹکراؤ بعض اوقات اختلافاتِ مجتہدین کا سبب بن جاتا ہے۔ مثلاً غسلِ جمعہ کے لئے جو روایت آتی ہے ان میں آپس میں ٹکراؤ پایا جاتا ہے۔ غسل جمعہ واجب ہے یا مستحب؟ اس میں علمائے تشیع میں اختلافات پایا جاتا ہے۔ کچھ پرانے علماء مثلاً محمد ابن یعقوب کلینی"، شیخ صدوق" اور شیخ بہائی" کے نزدیک غسلِ جمعہ واجب تھا۔ لیکن موجودہ زمانے کے اکثر مجتہدین غسلِ جمعہ کو مستحب مانتے ہیں۔ یہ اختلاف کیوں ہوا؟۔ احادیث ملاحظہ ہوں۔

ایک حدیث جو فروع کافی میں زرارہ ابن اعینؒ نے پانچویں امام، امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ:

ان غسل الجمعة واجب. (بے شک غسلِ جمعہ واجب ہے)۔

دوسری حدیث میں فرمان معصومؑ ہے کہ:

''اگر کوئی شخص غسلِ جمعہ نہ کر سکا تو اس پر غسل جمعہ رہے گا، ہفتہ تک قضا کر سکتا ہے''۔

تیسری حدیث کہ

''اگر غسل جمعہ کے لئے پانی نہ ہو تو پانی خرید کر لاؤ''۔

ان تمام احادیث سے تو بظاہر یہ لگتا ہے کہ غسل جمعہ واجب ہے۔ اب اس کے مقابلے میں فروع کافی ہی میں انہی زرارہ ابن اعینؓ سے اور انہی امام معصومؑ سے روایت کی گئی ہے کہ پوچھا مولاً سنت غسل کون سے ہیں۔ پھر امام نے سنت غسلوں کی فہرست بتائی اور اس میں غسلِ جمعہ کا نام بھی تھا۔ (جبکہ انہی صحابیؓ کی روایت کے مطابق غسل جمعہ واجب تھا) اور دوسری روایت جو شیخ صدوقؒ نے خصال میں لکھی ہے کہ پوچھا گیا کہ مولاً مرد اور عورت کی عبادتوں میں کتنے فرق ہیں۔ امامؑ نے کئی فرق بتائے۔ اس میں ایک یہ بھی تھا کہ مرد کے لئے غسل جمعہ مستحب ہے۔

﴿تقیہ کا مسئلہ﴾

یا مثلاً تقیہ کے متعلق مجتہدین میں اختلاف ہے کہ تقیہ رخصت ہے یا عزیمت ہے۔ مطلب سمجھانے کے لئے کہہ سکتے ہیں کہ

عزیمت۔ ایسی سہولت جس کا لینا واجب ہے۔

رخصت۔ ایسی سہولت جس کو چھوڑ بھی سکتے ہیں۔

وہ علماء جو جان کے تقیہ کو عزیمت کہتے ہیں وہ ایسی روایت کو لے کر آتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تقیہ کرنا واجب ہے (جبکہ تقیہ کا موقعہ ہو مثلاً حدیث لا تقیہ لمن لا دین لہٗ جس کے پاس تقیہ نہیں اس کا کوئی دین نہیں۔)

اور وہ علماء جو تقیہ رخصت قرار دیتے ہیں وہ یہ حدیث لے کر آتے ہیں۔ جس میں مسلمانوں کو کافروں نے پکڑ لیا اور کہا کہ ہمارے عقیدہ کا اقرار کرو۔ ایک نے انکار کر دیا تو کافروں نے اس کو قتل کر دیا۔ دوسرے نے یہ حالت دیکھی تو خلافِ عقیدہ

باتوں کا اقرار کرلیا۔ اب وہ خدمت رسولؐ میں آئے اور پیغمبرؐ اسلام کو تمام حالات بتائے تو رسولؐ خدا نے فرمایا'' کہ پہلے نے تو جنت میں جانے میں جلدی کی اور تو نے بھی جنت کو بچالیا''۔

یعنی رسولؐ اسلام نے دونوں کو شاباش دی اور اگر تقیہ عزیمت ہوتا اور کرنا واجب ہوتا تو پہلے والے صحابی کا عمل غلط ہوجاتا۔ اب اس روایت سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ تقیہ رخصت ہے۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دو مجتہدین تقیہ کے بارے میں ایک ہی فتوئی دیں۔ لیکن مقامِ استعمال میں دونوں کا نظریہ الگ ہوسکتا ہے۔

روایت کے ٹکراؤ کی صورت میں مجتہدین کا عمومی طریقہ

اگر دو برابر قوت کی روایتیں باہم ٹکرا رہی ہوں۔ وہیں سے مجتہد کا اصل امتحان شروع ہوتا ہے اور وہ ہے ''جمع بین الروایتین''، جسے مجتہد نورِ اجتہاد سے حل کرتا ہے۔ اور جس میں اصولِ فقہ کے بعض قوانین سے بھی مدد لی جاتی ہے۔

مطلق اور مشروط کا ٹکراؤ

مثلاً اصولِ فقہ کا مسئلہ ہے کہ اگر ایک روایت مطلق ہو (بغیر کسی شرط یا قید کے) اور دوسری روایت مقید ہو (جس میں کوئی قید یا شرط لگائی گئی ہو) تو اس مطلق روایت کو ہم مقید کرلیں گے۔

مثلاً اگر یہ روایت ہو کہ شبِ قدر میں دو رکعت نماز پڑھنا مستحب ہے۔ تو اب یہ روایت مطلق ہے اور اس میں کسی شرط کا ذکر نہیں ہے۔ اب دوسری روایت آجائے کہ صبح کے قریب دو رکعت نماز پڑھنا مستحب ہے۔ تو اب اس روایت میں شرط ہے اور صبح کے قریب ہونے کی قید لگائی گئی ہے تو اب طریقہ کار یہ ہے کہ دوسری والی روایت کو

پہلی روایت پر حاوی کر دیا جائے گا اور کہیں گے کہ پہلی روایت میں بھی مراد آخر شب ہے۔یعنی مطلق روایت جب مشروط سے ٹکراتی ہے تو وہ بھی مشروط ہو جاتی ہے۔

واجب و حرام کا ٹکراؤ

اصولِ فقہ میں ایک اصول یہ بھی ہے کہ کسی شے کو حرام کرنے والی روایت جب اس چیز کو واجب کرنے والی روایت سے ٹکراتی ہے تو حرام کرنے والی روایت کی طاقت عام طور پر واجب قرار دینے والی روایت سے زیادہ ہوتی ہے یا اس کو کاٹ دیتی ہے یا اس کے مطلب کو کم کر دیتی ہے یا اس کے دائرے کو چھوٹا کر دیتی ہے۔ مثلاً اگر ایک روایت میں ہو کہ علماء کا احترام کرنا واجب ہے۔ (واجب کرنے والی روایت) اور دوسری روایت میں اگر ہو کہ خبردار فاسق و فاجر عالم کا احترام نہ کرنا۔ (حرام کرنے والی روایت)۔

تو اب یہاں حرام کرنے والی روایت، واجب کرنے والی روایت کو چھوٹا کر دے گی اور اس کا جمع اس طرح ممکن ہوگا کہ تمام علماء کا احترام واجب ہے سوائے دین فروش اور فاسق و فاجر علماء کے۔

دو ہم کی روایات میں ٹکراؤ

یا جیسے مثلاً نماز جمعہ کے مسئلے میں ۲ برابر قوت کی روایتیں آپس میں ٹکرا رہی ہیں۔

ایک روایت کے مطابق:

جمعہ کے دن نماز جمعہ پڑھنی واجب ہے۔

دوسری روایت کے مطابق:

جمعہ کے دن نماز ظہر پڑھنا واجب ہے۔

تیسری روایت کے مطابق

ہفتہ کی کل نمازیں ۳۵ ہیں۔ جو یہ بتا رہی ہیں کہ جمعہ کے دن بھی ۵ ہی نمازیں واجب ہیں، چھ نہیں ہیں کیونکہ اگر نماز جمعہ واجب ہوتی تو ہفتے کی نمازیں ۳۶ ہو جاتیں۔

اب دونوں روایات جو برابر قوت کی ہیں، آپس میں ٹکرا رہی ہیں۔ اب یہاں نہ ایک روایت مطلق ہے نہ دوسری مقید۔ ورنہ مقید کو مطلق پر حاوی کر دیتے اور نہ یہاں واجب وحرام والی روایت ہے ورنہ حرام قرار دینے والی روایت کو واجب قرار دینے والی روایت پر حاوی کر کے اس میں استثناء ڈال دیتے۔ تو اب یہاں اصول فقہ کا دوسرا اصول استعمال کیا گیا ہے۔ جب ۲ روایتیں آپس میں ٹکرائیں (مثلاً نماز جمعہ و ظہر) تو اب اس میں ہمارے مجتہدین کے ۲ گروہ ہیں۔

ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ جب ۲ ایسی روایتیں ٹکرائیں کہ جب دونوں سے بچنے کا راستہ نہ ہو، نہ ان کو ملا سکتے ہوں، نہ جوڑ سکتے ہوں، نہ جمع کر سکتے ہوں تو اس صورت میں احتیاط واجب یہ ہے کہ دونوں پر عمل کرو۔ یہ مسئلہ زیادہ تر پرانے فقہاء کا تھا۔ ان کے نزدیک نماز جمعہ بھی پڑھنا پڑے گی اور نماز ظہر بھی۔

دوسرا گروہ مجتہدین یہ کہتا ہے کہ جب دو روایتیں ایسی ہوں کہ نہ تو ان میں مطلق و مقید ہو اور نہ واجب وحرام والا مسئلہ تو پھر یہ دونوں روایتیں ''واجب تخیری'' بتاتی ہیں۔ یعنی معصومؑ نے یہ اختیار دیا ہے کہ دونوں میں سے کسی کو بھی ادا کر دو۔ یعنی مثلاً نماز جمعہ وظہر واجب تخیری ہیں کوئی سی بھی پڑھ لو۔

چھٹی وجہ

روایت بالمعنیٰ کی وجہ سے۔ یعنی صحابہ کرامؓ اور تابعین کے ابتدائی دور میں

روایت بالفظ کا اتنا اہتمام نہیں تھا بلکہ اکثر مقامات پر رسولؐ کے ارشاد کو اپنے الفاظ میں نقل کر دیا جاتا تھا چونکہ روایت بالفظ مشکل تھی اس لئے روایت بالمعنیٰ بھی نقل کر دی جاتی تھی اور اسی وجہ سے بزرگ ومحتاط صحابہ حضورؐ کی طرف نسبت کم فرماتے تھے اور روایت کے بالمعنیٰ ہونے کی وجہ سے اختلاف ناگزیر تھا کیونکہ تعبیراتِ مختلفہ سے روایات میں اختلاف ہو ہی جاتا ہے۔

ساتویں وجہ

کثرت وسائط۔ کہ احادیث کی روایات میں جس قدر واسطے بڑھتے گئے سابقہ سب وجوہات کی بناء پر ان میں اتنا ہی اختلاف پیدا ہوتا گیا۔ یہ وجہ ظاہر ہے کہ ہر شخص اس کا تجربہ کر سکتا ہے۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ کسی قاصد کے ہاتھ آپ ایک بات کہلا کر بھیجتے ہیں لیکن اس بات کو پہنچانے میں اگر چند واسطے ہو جائیں تو اس میں اختلاف لازمی اور بدیہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے روایت کو ترجیح دینے کی وجوہات میں علو سند (یعنی واسطوں کے کم ہونے کو) کو ایک بڑی وجہ قرار دی ہے۔ کیونکہ عقلاً نقلاً تجربۃً ومشاہدۃً کثرت وسائط اختلاف کا سبب ہوا کرتے ہیں۔

آٹھویں وجہ

احادیث کے راویوں کا سہو ونسیان۔ کیونکہ سہو ونسیان لوازمِ بشر میں سے ہیں اور سب ہی کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ اس لئے نقل روایت میں سہو کا ہونا ممکن ہے۔ بہت سی ایسی مثالیں ہیں جہاں روایت کو نقل کرنے والوں سے باوجود ان کے معتبر اور سچے ہونے کے غلطی کا صدور ہوا ہے۔ اسی وجہ سے علماء نے خبر واحد پر عمل کرنے کے لئے بہت سے اصول مقرر کئے ہیں کہ ان پر روایت کو پرکھ لیا جائے۔ اگر قواعد کے مطابق ہو تو عمل کیا جائے ورنہ نہیں اور اسی وجہ سے آئمہؑ سے منقول احادیث کی وجہ

سے فقہاء ہمیشہ اس حدیث کو ترجیح دیتے ہیں جو مضمون قرآن کے مطابق ہو اگرچہ دوسری طرف کے روایت کرنے والے زیادہ ثقہ یا تعداد میں زیادہ ہی کیوں نہ ہوں۔

نویں وجہ

کتب احادیث کا ضائع ہو جانا۔ ہمارے زمانہ میں کتب حدیث کی چار بڑی کتابیں ہیں۔

(۱) اصول کافی (۲) تہذیب الاحکام عن المسائل الحلال والحرام

(۳) استبصار فی مختلف من الاخبار (۴) کتاب الفقیہ لمن لا یحضرہ الفقیہ

لیکن شیخ صدوقؒ کے دور میں احادیث کی ۵ بڑی کتابیں تھیں اور پانچویں تھی مدینۃ العلم جو بارہ جلدوں کی تھی اور علم حدیث کی سب سے بڑی کتاب تھی وہ غائب ہو گئی۔ اس زمانے کے علماء کے سامنے مدینۃ العلم کی احادیث تھیں جس کی بنیاد پر انہوں نے فتوے دیئے تھے۔ لیکن آج کے دور کے مجتہدین کے پاس وہ احادیث نہیں پہنچیں۔ ان کے فتوے کچھ اور ہو گئے یا امام صادقؑ نے چار سو اصولوں پر مشتمل کتب لکھوائیں جنہیں اصول اربعماۃ کہا جاتا ہے۔ ان میں سے اب سب کی سب ہمارے پاس نہیں۔ لہٰذا جن تک احادیث پہنچیں ان کے فتاویٰ کچھ اور ہو گئے اور جن تک نہیں پہنچیں ان کے کچھ اور۔

دسویں وجہ

ضعف روایات۔ واسطوں کی کثرت کی وجہ سے بعض راوی غیر معتبر اور ضعیف بھی آ گئے اور یہ بھی کہ بعض راوی حافظہ کی خرابی یا کسی عارضے کی وجہ سے کچھ کا کچھ نقل کر دیتے تھے جن کی وجہ سے روایات میں گڑبڑ ہونے لگی اور غلط روایات بھی نقل کی جانے لگیں۔ اسی وجہ سے فقہاء نے حدیث پر عمل کرنے کے لئے ضروری قرار دیا ہے

کہ راوی کے حالات سے مکمل واقفیت ہو اور علم رجال میں مکمل بصیرت رکھی جائے۔

﴿اقسام حدیث﴾

یہاں بہتر ہوگا کہ ہم راویوں کے اعتبار سے چند اقسام احادیث کا تذکرہ کر دیں۔

(۱) حدیث متواتر

وہ روایت جس کو اتنے لوگوں نے بیان کیا ہو کہ بیک وقت اتنے افراد کا ایک جھوٹی بات پر جمع ہونا ناممکن ہو۔ مثلاً حدیث غدیر۔ (من کنت مولاه فهذه علی مولاه). ایسی روایات حدیثِ متواتر کہلاتی ہیں۔

(۲) حدیث صحیح

جس کے سب کے سب راوی شیعہ اور عادل ہوں۔ مثلاً حدیث زہب جو آٹھویں امامؑ نے نیشاپور میں ارشاد فرمائی تھی کہ:

کلمته لا اله الا الله حصنی فمن دخل حصنی امن من عذابی.

(لا الہ الا اللہ میرا قلعہ ہے جو اس قلعہ میں داخل ہوگیا اس نے عذاب خدا سے امان پائی)۔

(۳) حدیث حسن

وہ حدیث جس کے سب راوی شیعہ ہوں لیکن عادل نہ ہوں۔ مگر ممدوح ہوں (یعنی ان کی تعریف کی گئی ہو مگر اتنی نہیں کہ وہ عادل بن جائیں)۔

(۴) حدیث قوی

جس روایت کے سب راوی شیعہ ہوں لیکن ان کی مدح نہ آئی ہو، نہ قدح۔ یعنی

نہ ان کی برائی آئی ہو نہ اچھائی آئی ہو۔

(۵) حدیث موثق

جس روایت کے راویوں میں کوئی ایک غیر شیعہ ہو مگر اپنے مذہب کا عادل ہو اور جھوٹ کو حرام سمجھتا ہو۔ یہ روایات سب سے زیادہ تعداد میں ہیں۔

اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ چھٹے امامؑ کی شہادت کے بعد شیعوں کی دو تہائی تعداد غیر شیعہ ہو گئی۔ کیونکہ چھٹے امامؑ کے بیٹے اور ساتویں امامؑ کے بھائی عبداللہ فتح نے دعویٰ امامت کر دیا تھا اور ان کے ماننے والوں کی تعداد ساتویں امامؑ کے ماننے والوں سے بھی زیادہ ہو گئی تھی اور اسی طرح ساتویں امامؑ کے ایک اور بھائی اسماعیل کے ماننے والوں کی بھی کافی تعداد ہو گئی تھی۔ اب ان کو ماننے والے اکثر دیانتدار تھے اور دھوکہ کھا کر اس طرف چلے گئے تھے لیکن عادل تھے۔ یعنی جتنا سنا تھا چھٹے امامؑ سے اتنا ہی نقل کرتے ہیں۔ ان کی حدیثیں بھی لی گئیں ہیں جو موثق کہلاتی ہیں۔ اسی طرح سُنّی راویوں سے بھی احادیث لی گئی ہیں جو ان کے مذہب کے مطابق عادل ہوں۔

(۶) حدیث ضعف

یہ وہ حدیث ہے جس کا راوی غیر شیعہ بھی ہو اور اپنے مذہب کا غیر عادل بھی ہو۔

حاصل کلام

اب بہت سے علماء ایسے تھے جو یہ کہتے تھے کہ ہم صرف حدیث متواتر کو لیں گے، باقی حدیثوں کو نہیں لیں گے۔ تو اب ان کے فتاویٰ کچھ اور ہو گئے۔ لیکن بعض مجتہدین کے نزدیک حدیث متواتر کے ساتھ ساتھ حدیث صحیح کو بھی لیا جائے گا اور عمل کیا جائے گا۔ لیکن متقدمین علماء میں مثلاً سید مرتضیٰؒ حدیث صحیح پر بھی عمل کرنا غلط سمجھتے

تھے۔اب سید مرتضیٰؒ کا فتویٰ کچھ اور ہوگا اور ان علماء کا کچھ اور ہوگا جو حدیث صحیح پر بھی عمل کرنا جائز سمجھتے ہیں۔علامہ حلیؒ کے بعد تقریباً سب ہی مجتہدین کے نزدیک حدیث صحیح پر عمل کرنا جائز ہے اور اقسام حدیث مثلاً حدیث متواتر اور حدیث صحیح پر ان علماء کے نزدیک عمل ہوگا۔واجب وحرام کے سلسلے میں، لیکن مستحبات ومکروہات کے سلسلے میں حدیث حسن، حدیث قوی، حدیث موثق اور بعض کے نزدیک حدیث ضعیف بھی چل جاتی ہے۔اور اس پر بھی عمل ہوسکتا ہے۔(قاعدۃ التسامح فی ادلۃ السنن کے تحت)

اب مثلاً ہوسکتا ہے کہ آج سے ۱۰۰ سال بعد کا مجتہد اگر واجب وحرام کے سلسلے میں حدیث حسن کو لے گا تو اس کے فتویٰ میں وہ عمل واجب ہو جائے گا۔جبکہ موجودہ مجتہدین کے نزدیک وہ عمل مستحب تھا اور اس طرح فتوؤں میں اختلاف ہو جائے گا۔

کیونکہ ایک نقل کرنے والا ایک بات نقل کرتا ہے تو زید کے نزدیک وہ معتبر ہے تو عمرو کے نزدیک غیر معتبر ہے، زید کے نزدیک اس کا حافظہ قوی تھا تو عمرو کے نزدیک اس کا حافظہ قوی نہیں، تو اس طرح سے اور بہت سی وجوہات ہیں۔تو اس لحاظ سے زید کے نزدیک اس کی روایت سچی اور پکی اور عمرو کے نزدیک وہ ناقابل التفات۔

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی اہم ہے کہ راوی کے حافظہ کے متعلق ۵ جروح ہیں۔

(۱) اکثر غلط روایت نقل کر دینا۔

(۲) روایات کی نقل میں غفلت کرنا۔

(۳) کسی قسم کا وہم کرنا۔

(۴) معتبر راویوں کی مخالفت کر دینا۔

(۵) حافظہ میں کسی قسم کی خرابی ہونا۔

لہٰذا ان مختلف اسباب ضعیف کی بناء پر ایک روایت کسی ایک مجتہد کی تحقیق میں بچی ثابت ہوئی تو اس کے نزدیک وہ واجب العمل اور اس سے جو حکم ثابت ہو وہ واجب العمل۔ دوسرے مجتہد کے نزدیک وہ روایت معیار صداقت میں درجہ کمال کو نہیں پہنچی اس وجہ سے اس کے نزدیک اس سے حکم شرعی کا ثبوت دشوار۔ اور حقیقتاً اس اختلاف کی عقل بھی تصدیق کرتی ہے کہ جب روایات واحادیث کی صحت وسقم کا دارومدار رواۃ کے احوال پر ہے اور رواۃ کے احوال میں اختلاف تحقیق یقینی ہے تو روایات واحادیث پر عمل میں اختلاف بھی یقینی ہے۔ اس کی مثال اس بیمار کی سی ہے جو طبیبوں کے درمیان ہو ایک ڈاکٹر کے نزدیک اس کا مرض نہایت خطرناک ہے، دوسرے کے نزدیک معمولی اور تیسرے کے نزدیک بیمار کا وہم ہی اس کی بیماری کا سبب ہے۔ اسی طرح ایک راوی کسی مجتہد کے نزدیک معتبر ہے، تو کسی کے نزدیک غیر معتبر اور مطعون ہے۔ تو اسی حالت میں نہ ڈاکٹروں پر حملہ کیا جاسکتا ہے نہ آئمہ جرح و تعدیل پر بلکہ بیمار کے تیمارداروں سے یا احادیث وشریعت کے پیروؤں سے یہی کہا جائے گا کہ تمہاری نگاہ میں جس شخص کی تحقیق پر اعتماد ہو یا جس کی تم تقلید میں ہو اس کے ساتھ رہو نہ کہ یہ معجون مرکب بنا کر سب کا استعمال شروع کر دیا جائے۔ آئمہؑ حدیث نے بھی تصریح کی ہے کہ ناقدین حدیث کی مثال اس صراف کی سی ہے کہ جو سونے کو دیکھ کر تاڑ جاتا ہے کہ کھرا ہے یا کھوٹا۔

گیارھویں وجہ

جھوٹی روایات کا بنایا جانا۔ زمانہ رسولؐ کے بعد بھی ایک دور آیا جس میں لوگوں نے عملاً جھوٹ بولنا شروع کر دیا۔ ان جھوٹے لوگوں میں بہت سے ایسے تھے جو اپنے

اغراض کی وجہ سے حدیثیں گھڑ دیتے تھے۔ ایسی حالت میں جس قدر اختلاف بھی روایت میں واقع ہو، کم ہے۔ علماء ایک شخص کا واقعہ بھی نقل کرتے ہیں جو ایک زمانے میں خوارج کا سردار تھا، پھر اس کو توبہ کی توفیق نصیب ہوئی تو اس وقت اس نے یہ نصیحت کی کہ حدیث حاصل کرتے وقت اس کے رواۃ کی تحقیق کر لیا کرو۔ ہم لوگ جب کسی بات کو پھیلانا چاہتے تھے اس کو حدیث بنا لیا کرتے تھے۔

اسی طرح زنادقہ نے چودہ ہزار احادیث گھڑیں ہیں جن میں سے ایک شخص عبد الکریم ابن ابی العوجاء ہے۔ جس کو خلیفہ مہدی کے زمانے میں سولی پر چڑھایا گیا۔ جس وقت اس کو سولی دی جا رہی تھی تو اس نے کہا کہ میں نے چار ہزار حدیثیں گھڑی ہیں جن میں حلال اشیاء کو حرام بنایا اور حرام کو حلال بنایا۔

اور بعض لوگ محض کسی امیر یا بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے حدیثیں گھڑ لیا کرتے تھے۔ مثلاً معاویہ کے دور میں اس شخص کو انعام و اکرام سے نوازا جاتا تھا جو من پسند اشخاص کی مدح میں حدیثیں بنا کر لائے۔

اسی وجہ سے علمائے حدیث کو موضوع (جھوٹی) روایات کی رد میں بھی کتابیں تصنیف کرنا پڑیں اور کیونکہ کچھ روایات کے ساتھ ان وضعی روایات کا اختلاط بھی ہو گیا۔ لہٰذا اختلاف روایات کا ہونا اظہر من الشمس ہے۔

بارھویں وجہ

آئمہ اطہارؑ کے زمانے میں بعض احکام کا موضوع، ان احکام کی نوعیت اور ان کی خصوصیات واضح تھیں۔ لیکن بعد کے زمانے میں چونکہ وہ اصل موضوع باقی نہ رہا، اس لئے اختلاف رائے پیدا ہوا۔

مثلاً احکام نماز سے متعلق روایات میں آیا ہے کہ اگر حالتِ نماز میں بدن یا لباس

پر ایک درہم سے کم انسانی خون کا دھبہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔

اس روایت کا جس زمانے سے تعلق ہے۔ اس زمانے میں تمام لوگ درہم کے بارے میں جانتے تھے کہ کتنا ہوتا ہے۔ لیکن بعد کے زمانوں میں درہم کی وضع قطع کے بارے میں ناواقفیت کی بناء پر مختلف اقوال سامنے آئے۔

(۱) درہم ہتھیلی کے گڑھے کے برابر ہوتا ہے۔

(۲) درہم انگوٹھے کے پور کے برابر ہوتا ہے۔

(۳) درہم درمیانی انگلی کی پہلی پور کے برابر ہوتا ہے،

(۴) درہم انگشتِ شہادت کی پہلی پور کے برابر ہوتا ہے۔

تیرھویں وجہ

تقیہ کی وجہ سے۔ آئمہؑ کی کئی روایات تقیہ کی حالت میں کہی گئی ہیں تو ان روایات سے متعارض ہوتی ہیں جو اس وقت ارشاد فرمائی گئی تھیں کہ جب حالت تقیہ نہیں تھی۔ تو اب بہت سے مجتہدین کے نزدیک ایک روایت تقیہ کی حالت میں کہی گئی ثابت ہو جاتی ہے، ان کا فتویٰ کچھ اور ہو جاتا ہے اور بعض کے نزدیک وہ موارد تقیہ میں سے نہیں ہوتی ان کا فتویٰ کچھ اور ہو جاتا ہے۔

چودھویں وجہ

روایت کا سیاق وسباق معلوم نہ ہونا۔

آئمہؑ کی بہت سی روایات کا ایک سیاق وسباق اور Back ground تھا جس کے تناظر میں وہ کہی گئی تھیں۔ موجودہ مجتہدین کے سامنے وہ روایات تو آ گئیں لیکن اس کا وہ خاص Back ground نہیں آیا کہ جس حالت میں وہ کہی گئی تھی اور کیونکہ پرانے علماء و مجتہدین کی نگاہ میں وہ خاص سیاق وسباق تھا ان کے فتوے ان

مجتہدین کے فتووں سے الگ ہو گئے۔

ان وجوہات کے علاوہ بھی اختلافاتِ مجتہدین کے کئی اور اسباب بھی ہیں۔ مثلاً زبان عربی میں ایک لفظ کے کئی مختلف معنیٰ کا ہونا، اصول فقہ کے اختلافات وغیرہ جن کو خوف طوالت کے باعث ذکر نہیں کیا جا رہا ہے لیکن وہ بھی اپنی جگہ اہم ہیں۔

﴿ایک قابلِ غور نکتہ﴾

درحقیقت یہ اختلاف مجتہدین جو بظاہر افتراق معلوم ہوتا ہے۔ حقیقتاً افتراق نہیں اور جس درجے میں ہے اس میں رہنا ایک لازمی امر ہے جس کا عدم بھی امت کے لئے سخت تنگی کا سبب ہے اور چونکہ اختلاف ثمرہ ہے، اختلاف روایت واحادیث کا اس لئے ان میں بھی دینی مصلحت اس بات کی متقاضی تھی کہ اس کو اجمالی حالت میں اتارا جائے۔ اگر وہ حقائق شرعیہ عقائد کی طرح سے قطعی طور پر نازل کئے جاتے تو اختلاف مجتہدین کی گنجائش نہ ہوتی اور اس وقت اختلاف گمراہی کا سبب ہوتا اور عدم اختلاف امت کے لئے تنگی کا باعث ہوتا۔

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے مطابق وموافق نصوص سے استنباط اور اخذ کرے خواہ اس کی قابلیت رکھتا ہو یا نہیں۔ یہ سخت گمراہی کا سبب ہے اور یہ اختلافِ ممدوح نہیں بلکہ ممدوح اختلاف وہ ہے جو شرعی قواعد واصول کے ماتحت ہو۔

ایک سوال

جو اس بحث سے لازمی پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ فتویٰ کے لئے مجتہدین ایک شوریٰ یا کمیٹی کیوں نہیں تشکیل دیتے اور ایک میز پر تبادلہ خیال کر کے اختلافات رائے کو حل کیوں نہیں کر لیتے؟

سب سے پہلے تو یہ بات جان لینی چاہئے کہ مجتہدین فتویٰ جاری کرنے سے پہلے، تمام ضروری تحقیق، مطالعہ اور مشورہ اچھی طرح کر لیتے ہیں اور اس کے بعد فتویٰ صادر کرتے ہیں اور وہ جب کسی مسئلے کے بارے میں فتویٰ دیتے ہیں تو اس مسئلے سے متعلق تمام کتابوں اور دوسرے فقہاء کی آراء کا گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں اور اپنے درس کی مجالس میں تمام مختلف نظریات کو پیش کر کے مسئلے کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں اور اس کے بعد کسی ایک نظریہ کو ترجیح دیتے ہیں۔

حتیٰ کہ مراجع تقلید استفتاء کی مجالس تشکیل دیتے ہیں اور ان جلسوں میں مقلِدین کے سوالات اور ان کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے اور اچھی طرح تحقیق اور علمی مشوروں کے بعد کسی بھی سوال کے جواب میں قطعی اور آخری نظریے کو تحریر کیا جاتا ہے۔

لیکن پھر بھی یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ اگر چہ اس طرح کا مذاکرہ اور مشاورت بہت سے فوائد کی حامل ہوتی ہے لیکن پھر بھی اختلافِ رائے سو فیصد دور نہیں ہوتا۔ کیونکہ تمام علمی مشاورتوں میں جگہ جگہ اختلافِ رائے بدستور باقی رہتا ہے، مشاورت اور مذاکرہ اسے پوری طرح ختم نہیں کر سکتا۔

ماخذ

(۱) البیان فی التفسیر القرآن — آقائے خوئیؒ

(۲) فتنہ وضع احادیث — سید حسین رضوی

(۳) 20 جواب — دار الثقافۃ الاسلامیہ

(۴) اجتہاد و تقلید — آیت اللہ مشکینیؒ

(۵) امام صادقؑ پیشوا اور رئیس مذہب — عقیق بخشائش

(۶) منبع عدل — آیت اللہ امینیؒ

(۷) ولایت فقیہ — آیت اللہ منتظریؒ

(۸) رسالہ توحید

(۹) حکومت اسلامی — امام خمینیؒ

(۱۰) نہج البلاغہ — سید رضیؒ

(۱۱) تقاریر مولانا صادق حسن صاحب قبلہ

حضرت امام حسن عسکریؑ سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا کہ ایک دن انصاری کی عورتوں میں سے ایک عورت میری جدہ صدیقہ کبریٰ جناب فاطمۃ الزہراؑ کی خدمت میں آئی اور عرض کیا :

''اے دخترِ پیغمبرؐ! میری ماں بہت ضعیف اور کمزور خاتون ہے اور جب وہ نماز پڑھتی ہے تو اُسے نماز میں کچھ شک پیدا ہو جاتے ہیں۔ اُن کے بارے میں سوال کرنے کیلئے اُس نے مجھے آپؑ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ آپؑ سے اُن مسائل کے بارے میں پوچھوں''۔

جناب سیدہؑ نے فرمایا : ''پوچھو''۔

اُس عورت نے مسئلہ بیان کیا اور اُس کا جواب سنا۔ اُس نے دوسرا مسئلہ پوچھا اور اُس کا جواب بھی سنا۔ تیسری دفعہ سوال کرنے سے اُس نے شرم محسوس کی اور کہا کہ اب میں سوال نہیں کروں گی کیونکہ پہلے ہی کافی زحمت دے چکی ہوں۔

اس پر جناب سیدہؑ نے فرمایا : ''اے بی بی ! تم جتنے چاہو، سوال کرو اور شرم محسوس نہ کرو۔ کیا تم نے دیکھا ہے کہ ایک شخص کسی کے پاس ایک روز کیلئے مزدوری کرے اور اُسے کوئی سخت بوجھ بھی اُٹھانا پڑے، لیکن ایک روز کی مزدوری اُسے ایک لاکھ دینار ملنا ہو تو اُسے اُس بوجھ کی سختی محسوس نہیں ہوگی اور اُسے وہ بوجھ ہلکا لگے گا۔ اس وقت میری حالت بھی ایسی ہی ہے کیونکہ ہر سوال کا جواب جو دے رہی ہوں۔ خدا کے نزدیک اُس کا عظیم اجر ہے اور اُس کی قیمت زمین و آسمان کے درمیان اگر جواہر بھر دیئے جائیں تو اُن سے بھی زیادہ ہے۔ اب بتاؤ کہ زیادہ مسائل کا جواب دینا کیا میرے لئے دشوار یا سخت ہو سکتا ہے۔ میں نے اپنے بابا رسولؐ خدا سے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ شیعہ علماء قیامت کے روز ایسے لباس میں آئیں گے جن کی قدر و قیمت اُن کے علوم سے زیادہ ہوگی یعنی جس کا علم زیادہ ہوگا اور اس کی ترویج شریعت کیلئے سعی و کوشش زیادہ ہوگی، قیامت کے روز اُس کا لباس اُسی قدر قیمتی ہوگا اور اُن میں سے بعض ایسے بھی ہوں گے جن کے پاس

ہزار ہزار نورانی لباس ہوں گے جو اُن کو عطا کیے گئے ہوں گے۔

اُس وقت خدا کی جانب سے منادی ندا دے گا کہ اے آلِ محمدؐ کے یتامی (آلِ محمدؐ کے یتیم سے مراد وہ شخص ہے جو آلِ محمدؐ کو مانتا ہو لیکن جہل کی وجہ سے اپنے امام سے دور ہو اور احکامِ دین و شریعت سے بے بہرہ ہو) پر رحم کھانے والو اور اُن کے کفیل بننے والو اسی طرح اُن کو ذلت سے نکالنے والو ! یہ سب تمہارے شاگرد ہیں یعنی وہ تمام یتیم جن پر تم نے رحم کھایا تھا اور اُن کو جہل کی ظلمت سے نجات دلوائی تھی، وہ سب تمہارے شاگرد ہیں۔

پس تم آؤ اور اپنے شاگردوں کو اُن علوم کے اندازہ کے مطابق خلعتِ نور (نورانی لباس) عطا کرو۔ لہٰذا بہ حکمِ خدا علماء اپنے ان تمام شاگردوں کو نورانی لباس عطا کریں گے۔ اس کے بعد خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے اپنے فرشتوں کو حکم دیا جائے گا کہ اے میرے فرشتو ! ان علماء کو وہ نورانی لباس واپس کرو جو انہوں نے آلِ محمدؐ کے یتیموں کو دا کیے ہیں۔ فرشتے کئی گنا کے برابر اُن علماء کو وہ لباس واپس کر دیں گے۔

اس کے بعد جناب سیدہؑ نے اُس عورت سے کہا ''اے بی بی ! اُس نورانی لباس کا ایک ایک تار اُن تمام اشیاء سے ہزار درجے بہتر ہے جن پر سورج کی کرنیں پڑتی ہیں۔ وہ نورانی لباس کیوں نہ بہتر ہو کیونکہ دنیاوی لباس اور نعمتیں اکیلی نہیں ہوتیں بلکہ اُن کے ہمراہ پریشانیاں بھی ہوتی ہیں۔

(ماخوذ از : ''آرزوئے جبرئیل)

مؤلف : حجۃ الاسلام میرزا باقر الحسینی